درس ٦

بگڑے ہوئے مسلمان معاشرے میں اسلامی انقلاب کے لیے آخری اقدام کا عنوان: 'نہی عن المنکر' اور 'محافظتِ حدود اللہ' کے ضمن میں طاقت کا مظاہرہ اور چیلنج

نحمدہٗ ونصلّی علٰی رسولہِ الکریم ...... امّا بعدُ :

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم ...... بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقٰتِہٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ص وَاذْکُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ اِذْ کُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِکُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِہٖٓ اِخْوَانًا ج وَکُنْتُمْ عَلٰی شَفَا حُفْرَۃٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَکُمْ مِّنْھَا ط کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمْ اٰیٰتِہٖ لَعَلَّکُمْ تَھْتَدُوْنَ ﴿۱۰۳﴾ وَلْتَکُنْ مِّنْکُمْ اُمَّۃٌ یَّدْعُوْنَ اِلَی الْخَیْرِ وَیَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ ط وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۴﴾﴾

(آل عمران)

﴿اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ ط یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَیَقْتُلُوْنَ وَیُقْتَلُوْنَ قف وَعْدًا عَلَیْہِ حَقًّا فِی التَّوْرٰىۃِ وَالْاِنْجِیْلِ وَالْقُرْاٰنِ ط وَمَنْ اَوْفٰی بِعَھْدِہٖ مِنَ اللّٰہِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَیْعِکُمُ الَّذِیْ بَایَعْتُمْ بِہٖ ط وَذٰلِکَ ھُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ﴿۱۱۱﴾ اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰکِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاھُوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰہِ ط وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۱۲﴾﴾ (التوبۃ) ...... صدق اللہ العظیم

دروس کی ترتیب پر ایک نظر

اِن نشستوں میں منتخب نصاب (۲) کے دروس جس ترتیب سے آ رہے ہیں اس کو دوبارہ ذہن میں تازہ کر لیجیے۔ درحقیقت درس اوّل میں ہمارے اصل اور بنیادی منتخب نصاب (۱) اور اس منتخب نصاب (۲) کے مابین ربط قائم کیا گیا ہے۔ جہادِ فی سبیل اللہ اور اس کا ہدف اوّلین شہادت علی الناس' جو سورۃ الحج کی آخری آیت میں مذکور ہے: ﴿وَجَاھِدُوْا فِی اللّٰہِ حَقَّ جِھَادِہٖ ط﴾ (آیت ۷۸) ''اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں جیسا کہ اس کی راہ میں جہاد کا حق ہے''۔ اور اس کی غرض و غایت' اس کا مقصد بھی اسی آیت میں بیان ہوا: ﴿لِیَکُوْنَ الرَّسُوْلُ شَھِیْدًا عَلَیْکُمْ وَتَکُوْنُوْا شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ ج﴾ ''تا کہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر گواہ ہو''۔ پھر سورۃ الصّف کے حوالے سے جہاد کی نہایت زوردار دعوت ہے ان الفاظِ مبارکہ میں: ﴿تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَتُجَاھِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ بِاَمْوَالِکُمْ وَاَنْفُسِکُمْ ط﴾ (آیت ۱۱) ''تم ایمان لاؤ اللہ اور اُس کے رسولؐ پر اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ''۔ اور اس کا ہدف' اس کی غایتِ قصویٰ اور اس کی آخری منزل بیان ہوئی سورۃ الصّف کی آیت ۹ میں: ﴿ھُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْمُشْرِکُوْنَ ﴿۹﴾﴾ ''وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو الہدیٰ (قرآن حکیم) اور دین حق دے کر تا کہ اسے غالب کرے کُل کے کُل نظامِ زندگی پر''۔ یہ دونوں مقامات ہمارے منتخب نصاب (۱) میں شامل ہیں۔

شہادت علی الناس اور غلبۂ دین کے تصور کو مزید مؤکد کیا گیا اس منتخب نصاب (۲) کے درس اوّل میں‘ جو سورۃ الشوریٰ کی آیات ۱۳ تا ۱۵ پر مشتمل ہے‘ جس میں اقامتِ دین کا تصور سامنے آیا۔ اس میں اقامتِ دین کے لیے نہ صرف پکارا گیا ہے بلکہ للکارا گیا ہے: ﴿اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ ط﴾ ”یہ کہ تم دین کو قائم کرو اور اس (دین کے معاملہ) میں متفرق مت ہو جانا“۔ اس درس کے ضمن میں عرض کر چکا ہوں کہ ۵۳ آیات پر مشتمل اس پوری سورت (الشوریٰ) میں جمع کے صیغہ میں صرف ایک ہی فعل امر آیا ہے: ﴿اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ﴾ اور ایک ہی فعل نہی آیا ہے: ﴿وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ﴾ اور پھر سورت کے آخر میں جا کر دوبارہ ان دونوں کے لیے زوردار دعوت ہے۔ ویسے تو ”امر“ اور ”نہی“ دونوں میں اللہ کا حکم آ گیا‘ لیکن سورت کے آخری حصے میں اسے مزید مؤکد کیا گیا: ﴿اِسْتَجِیْبُوْا لِرَبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ یَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ ط مَا لَكُمْ مِّنْ مَّلْجَاٍ یَّوْمَىِٕذٍ وَّمَا لَكُمْ مِّنْ نَّكِیْرٍ ﴿۴۷﴾﴾ ”اپنے ربّ کا حکم مان لو اُس دن کے آنے سے پہلے کہ جس کے ٹلنے کی کوئی صورت اللہ کی طرف سے نہیں ہے۔ اس دن تمہارے لیے کوئی جائے پناہ نہ ہوگی اور نہ کوئی تمہارے حال کو بدلنے والا ہوگا“۔

شہادت علی الناس اور غلبۂ دین کی یہ جدوجہد کس نے کی؟ اور وہ لوگ کن اوصاف کے حامل تھے؟ یہ سورۃ الفتح کی آخری آیت کا مضمون ہے جو ہمارے اس منتخب نصاب (۲) کے درس دوم میں ”اقامتِ دین کے لیے کام کرنے والوں کے مطلوبہ اوصاف“ کے عنوان سے شامل ہے۔ پھر اسی عنوان کے تحت سورۃ المائدۃ کی آیت ۵۴ اور سورۃ الشوریٰ کی آیات ۳۶ تا ۴۳ بھی اس نصاب میں شامل کی گئی ہیں۔

ان اسباق کے ذریعے یہ بات معین ہوگئی کہ اگرچہ مسلمان کا اصل نصب العین سوائے نجاتِ اُخروی اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کے اور کچھ نہیں‘ تاہم اس دنیا میں اس کی جدوجہد کا اصل ہدف اور اس کے لیے منزل اللہ کے دین کا غلبہ اور اس نظام کا بالفعل قیام ہے جس میں اللہ کو حاکمِ حقیقی تسلیم کیا جائے اور اسی کو شارعِ حقیقی مانا جائے۔ ظاہر ہے اُس کے نمائندے کی حیثیت سے محمدٌ رسول اللہ ﷺ ہیں‘ لیکن حاکمِ حقیقی اللہ ہے ﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ﴾۔ اس تصور کو ہم نے ایک جدید اصطلاح ”اسلامی انقلاب“ سے واضح کیا۔ یہ انقلاب لازماً افراد سے شروع ہوگا‘ اور افراد میں بھی ان کے اذہان وقلوب سے۔ اور اس کا نتیجہ عملی انقلاب ہوگا۔ پھر جو افراد جمع ہوں گے وہ ایک بنیانِ مرصوص بنیں گے‘ ایک قوت کی شکل اختیار کریں گے اور یہ قوت اللہ کے دین کے اس غلبے کے راستے میں مزاحم قوتوں کو چیلنج کرے گی اور اُن سے ٹکرائے گی۔ اس چیلنج اور ٹکراؤ کے نتیجے میں اگر اللہ کو منظور ہوا تو اللہ کا دین غالب ہو جائے گا‘ بصورتِ دیگر ایسے افراد اللہ کی راہ میں اپنی جانیں دے کر سرخرو ہو جائیں گے۔ یہ بالکل دو اور دو چار کی طرح سیدھا اور واضح راستہ ہے۔ انسان کے دل میں اگر چور ہو تو وہ جدھر سے چاہے چور دروازہ بنائے اور نکل جائے‘ لیکن یہ بالکل سیدھا راستہ ہے‘ سیدھا تصور ہے۔ اس میں کہیں جھول اور ہیر پھیر نہیں ہے‘ اس میں کہیں تکلف اور تصنع نہیں ہے۔

اب جہاں تک اس انقلاب کے عمل کا تعلق ہے‘ اس کے ضمن میں پہلی بات جس کو ہم نے نمایاں کیا ہے وہ یہ کہ یہ انقلاب محض اسی راستے سے آ سکتا ہے جس راستے سے محمدٌ رسول اللہ ﷺ نے برپا کیا تھا‘ جیسا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا قول ہے‘ جسے امام مالکؒ نے اپنے الفاظ میں یوں بیان کیا ہے:

” لَا یَصْلُحُ آخِرُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اِلَّا بِمَا صَلَحَ بِهٖ اَوَّلُهَا “

”اس اُمت (مسلمہ) کے آخری حصہ کی اصلاح محض اسی طریق پر ہوگی جس پر کہ پہلے حصہ کی ہوئی ہے“۔

دیگر تبلیغی‘ تدریسی‘ تعلیمی اور اصلاحی کام وغیرہ تو اس کے بغیر ہو سکتے ہیں‘ ان میں سے ہر ایک اہمیت کا حامل ہے‘ لیکن اگر اقامتِ دین اور اظہارِ دین الحق علی الدین کلّہ کا کلّی تصور سامنے ہو تو اس کے لیے راستہ سوائے اُسوۂ رسولؐ کے اور کوئی نہیں۔ ذاتی اصلاح کے لیے اگر کوئی خانقاہی نظام پہلے کی طرح اب بھی موجود ہو اور مفید نتائج برپا کر رہا ہو تو اس کی نفی نہیں ہے۔ اسی طرح وعظ وتلقین وارشاد کا جو سلسلہ بھی اجتماعی اور انفرادی سطح پر ہو رہا ہے‘ اس کی بھی نفی نہیں ہے‘ وہ بھی ایک خدمت ہے کہ جو ہو رہی ہے۔ دین کی تعلیم وتدریس کا کوئی کام کہیں ہو رہا ہے‘ وہ چاہے چھوٹے پیمانے پر ہو چاہے بڑے پیمانے پر ہو‘ اس کی بھی نفی نہیں ہے۔ وہ بھی ایک مفید خدمت ہے جو ہو رہی ہے۔ لیکن اگر ﴿اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ﴾ اور ﴿وَیَكُوْنَ الدِّیْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ﴾ کے قرآنی احکام کے حوالے سے غلبۂ دین اور اقامتِ دین کا کلّی تصور پیش نظر ہو کہ دین کُل کا کُل اللہ ہی کے لیے ہو جائے تو اس کے لیے ہمیں پوری طرح غور وفکر اور سوچ بچار کر کے اور پوری باریک بینی سے اپنی تمام ذہانت اور استعداد کو بروئے کار لا کر خالص معروضی طور پر یہ سمجھنا ہوگا کہ محمدٌ رسول اللہ ﷺ نے یہ کام کیسے کیا! اس پر میری مفصل تقریریں تحریری صورت میں چھپ چکی ہیں۔

منہج انقلابِ نبویؐ کا حالاتِ حاضرہ پر انطباق

اب اس غور وفکر اور سوچ بچار کے دو مراحل ہوں گے۔ پہلے مرحلے میں ایک خالص معروضی مطالعہ (absolutely objective study) کرنا ہوگا کہ حضور ﷺ نے اقامتِ دین کا کام کیسے کیا۔ اس میں دو چیزیں نمایاں ہو رہی ہیں، جس کو میں نے ''سیرت'' اور ''فلسفۂ سیرت'' سے تعبیر کیا ہے۔ سیرت تو اس جدوجہد کے سلسلہ وار مراحل بتائے گی کہ آپ ﷺ نے ابتداءً یہ کیا، پھر یہ کیا، پھر یہ کیا، لیکن یہ سوال کہ ایسا کیوں ہے؟ اس کی کیا حکمتیں ہیں؟ حضور ﷺ نے پہلے یہ قدم کیوں اٹھایا؟ پھر یہ دوسرا قدم کیوں آیا؟ پہلے اور دوسرے قدم کے مابین کتنا فاصلہ ہے؟ دوسرا قدم اٹھانے کے لیے کیا شرائط ہیں، کیا لوازم ہیں، کون سے تقاضے کس حد تک پورے ہو چکے ہوں کہ اگلا قدم اٹھایا جائے گا؟ ان تمام سوالات کا واضح طور پر جواب سیرت النبی ﷺ میں نہیں ملتا، بلکہ یہ چیزیں ''فلسفۂ سیرت'' کے طور پر سیرت سے اخذ کرنی ہوں گی۔

دوسرے مرحلے میں ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ جس ماحول اور جس دَور میں ہم یہ کام کر رہے ہیں اس کے اعتبار سے آیا سیرت النبی ﷺ سے اخذ شدہ طریق کار میں ہمیں کہیں کسی تبدیلی کی ضرورت ہے؟ بجائے اس کے کہ غیر شعوری طور پر انسان زمانی اور مکانی عوامل سے متأثر ہو کر کوئی تبدیلی کر لے، اسے شعوری طور پر اس چیز کو معین کرنا چاہیے، تاکہ صغریٰ کبریٰ جوڑ کر جو نتیجہ نکالا گیا ہو اُس پر نظر ثانی بھی ممکن ہو سکے، اور برعکس نتائج نکلنے کی صورت میں یہ دیکھا جا سکے کہ آیا اس معاملے میں ہمارا صغریٰ غلط تھا یا کبریٰ غلط تھا! ان چیزوں کو میں اپنی تقاریر میں معین کر چکا ہوں۔

اقامت دین کے لیے پہلا مرحلہ دعوت کا ہے۔ اس میں تو زمان و مکان کے تغیر سے کوئی فرق و تفاوت نہیں ہوگا، بلکہ یہ عین منہاجِ نبویؐ کے مطابق ہوگی۔ دوسرا مرحلہ تنظیم کا ہے۔ اس کے طریق کار میں صرف ایک فرق ہوگا۔ وہ یہ کہ وہاں تو تنظیم کی اصل بنیاد تھی نبی اکرم ﷺ پر ایمان، ان کی تصدیق۔ گویا جس نے آپ ﷺ کو نبی اور رسول مانا وہ مطیع ہے۔ اس کے لیے کسی اضافی بیعت کی فی الاصل ضرورت نہیں تھی۔ میرے نزدیک سیرت النبی ﷺ میں بیعتوں کا جو نظام ہمیں نظر آتا ہے وہ دراصل بعد والوں کی راہنمائی کے لیے ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کا قول نہایت اہم ہے، اسے یاد رکھنا چاہیے۔ غزوۂ بدر سے قبل ہونے والی مجلسِ مشاورت میں انہوں نے عرض کیا تھا: اِنَّا آمَنَّا بِكَ وَصَدَّقْنَاكَ...... حضور ﷺ! آپ متردّد کیوں ہیں؟ آپ شاید اس خیال کی وجہ سے متردّد ہیں کہ ہم نے بیعت عقبۂ ثانیہ میں صرف یہ وعدہ کیا تھا کہ اگر مدینے پر حملہ ہوگا تو ہم آپ کی حفاظت کریں گے! لیکن ہمارے سامنے تو یہ حقیقت موجود ہے کہ ہم آپؐ پر ایمان لائے ہیں، ہم نے آپؐ کی تصدیق کی ہے، ہم نے آپؐ کو نبی مانا ہے، رسول مانا ہے۔ اب ہمارے لیے استثناء کہاں ہے؟ آپؐ جو حکم دیں گے ہم بسر و چشم اس کی تعمیل کریں گے۔ آپ ہمیں حکم دیں گے تو ہم اپنی سواریاں سمندر میں ڈال دیں گے، آپ حکم دیں گے تو ہم اپنی اونٹنیوں کو لاغر کر دیں گے، لیکن برک الغماد تک جا پہنچیں گے۔ آپ حکم دیجیے ہم حاضر ہیں! یہ ہے وہ اصل بات۔ لیکن ظاہر بات ہے کہ تنظیم کی یہ بنیاد اَب کبھی نہیں ہوگی۔ لہٰذا اب ہمارے پاس اس کے لیے صرف ایک ہی مسنون و ماثور راستہ ہے، ایک ہی اساس اور بنیاد ہے اور وہ بیعت ہے۔ اس پر ہمارے دروس تفصیلاً ہو چکے ہیں۔

اس کے بعد تیسرا مرحلہ آتا ہے تربیت اور تزکیہ کا۔ اس میں بھی اگر ہم نے بعینہٖ وہی رُخ اختیار نہ کیا جو محمدٌ رسول اللہ ﷺ کا ہمیں نظر آتا ہے تو اس تربیت اور تزکیہ سے وہ اوصافِ مطلوبہ کبھی پیدا نہیں ہوں گے جو اقامت دین کی جدوجہد کے لیے ضروری ہیں۔ طریقِ نبویؐ سے ہٹ کر اگر تزکیہ اور تربیت کا عمل اختیار کیا جائے تو اِس میں ہو سکتا ہے کہ کچھ روحانی ترقع پیدا ہو جائے، کچھ کشف و کرامت کا زیادہ عمل دخل ہمیں نظر آنے لگے، لیکن وہ صورت ہرگز پیدا نہیں ہوگی جو ایک انقلابی جدوجہد کے لیے ناگزیر ہے۔ کشف و کرامت کی بھی نفی قطعاً نہیں ہے، لیکن دراصل جو طریقِ تربیت و تزکیہ محمدٌ رسول اللہ ﷺ نے اختیار فرمایا ہمیں حتی الامکان اسے اختیار کرنا ہے۔ البتہ کس حد تک ہم اس طریق کار کے تقاضوں کو پورا کر سکیں گے، یہ بات دوسری ہے، اس کا تعلق کمیت سے ہے، یہ quantitative element ہے۔ لیکن اپنی امکانی حد تک معروضی مطالعہ کر کے ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ اس تربیتی نظام کے کیا اجزائے ترکیبی تھے جو محمدٌ رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہیں اور ہمیں اپنی امکانی حد تک اس کی پیروی کرنی ہے۔

چوتھا مرحلہ صبر محض (passive resistance) کا ہے۔ یہ زبانی ایذاء کے مقابلے میں بھی ہوگا، جیسے حضور ﷺ سے فرمایا گیا: ﴿فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ﴾ (طٰہٰ: ۱۳۰) اور ﴿وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ ﴿٩٧﴾﴾ (الحجر) اور جسمانی ایذاء کے مقابلے میں بھی ہوگا، جس کا سورۃ العنکبوت میں ذکر آیا: ﴿فَاِذَآ اُوْذِيَ فِي اللّٰهِ﴾ (آیت ۱۰)۔ یہ مرحلہ بھی جوں کا توں رہے گا، یعنی زبانی اور جسمانی ایذاؤں کے مقابلے میں ثابت قدم رہنا ہے اور جوابی کارروائی ہرگز نہیں کرنی۔ اب سوال ہے کہ یہ صبر محض (passive resistance) کا مرحلہ کب تک رہے گا! تو جان لیجیے کہ جب تک مکمل تجزیے کے بعد یہ رائے قائم نہ ہو جائے کہ اب ہمارے پاس اتنی قوت موجود ہے اور وہ مناسب تربیت پا چکی ہے کہ اب وہ اقدام کرے، چیلنج کرے اور اس قائم نظام کی دکھتی رگ کو کہیں سے چھیڑے، اُس وقت تک یہ صبر محض جاری رہے گا۔

اب آگے سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس اقدام کی صورت کیا ہوگی؟ تو پہلے یہ جان لیجیے کہ اب اُس دَور میں اور اِس دَور میں بہت فرق واقع ہو چکا ہے۔ لہٰذا اب ہمارے سامنے دوعوامل کارفرما رہیں گے۔ ایک عامل یہ کہ وہاں حضورﷺ بذاتِ خود موجود تھے۔ آپ ؐکا اپنا ایک مقام اور مرتبہ ہے۔ پھر یہ کہ وہاں ایک طرف مسلمان اور دوسری طرف کافر تھے۔ جو آپ ؐ پر ایمان لایا وہ مسلمان‘ جو ایمان نہیں لایا‘ وہ چاہے اپنی جگہ پر کتنا ہی نیک اور شریف آدمی ہو اور چاہے وہ موحد کامل ہی کیوں نہ ہو‘ وہ کافر۔ لہٰذا وہاں بالکل دو ٹوک اسلام اور کفر کی جنگ تھی۔ یہاں یہ معاملہ نہیں ہے۔ یہاں بگڑا ہوا مسلمان معاشرہ ہے۔ درس کے عنوان میں اسی کو شامل کیا گیا ہے۔ یہاں سب مسلمان ہیں‘ شرعاً مسلمان‘ فقہی طور پر مسلمان۔ اور مسلمان کے کچھ حقوق ہیں۔ یہ وہ حقیقت ہے جس سے ایک بنیادی فرق واقع ہوا جس کو ملحوظ رکھنا پڑے گا۔ بعض لوگ اپنے جوشِ تبلیغ اور جذبے میں اس کو نظر انداز کر دینے کی طرف چلے گئے۔ اُن میں پھر سختی اور انتہا پسندی آئی ہے‘ اور یہ انتہا پسندی بہت خطرناک ہے۔ مسلمان بہرحال مسلمان ہے‘ خواہ کوئی فاسق ہے یا فاجر ہے‘ کوئی اوہام میں مبتلا ہو گیا ہے‘ کوئی شرکِ خفی میں مبتلا ہے‘ بلکہ اگر کوئی شرکِ جلی بھی کر رہا ہے لیکن اس کی کوئی تاویل کر رہا ہے‘ تو ان معاملات کا سارا تعلق افتاء اور قضاء سے ہے۔ ہم اپنے جوش میں آ کر انہیں مشرک‘ کافر یا اس طرح کا کوئی اور لقب نہیں دے سکتے۔ مسلمان بہرحال مسلمان ہے‘ لہٰذا یہاں اب منطقی طور پر کچھ فرق لازمی ہوگا۔

میں اس کا ہرگز قائل نہیں ہوں کہ اقامت دین صرف جمالِ روحانی یا جمالِ عقلی سے ممکن ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔ اقامت دین یا بالفاظِ دیگر غلبۂ دین حق کے لیے آخری مرحلہ آئے گا جس میں لازماً سر دھڑ کی بازی لگانی پڑے گی۔ اِس لیے کہ اس کا تعلق اصل میں ایک جمے ہوئے مضبوط نظام کو جڑ سے اکھیڑنے سے ہے‘ جس میں مختلف طبقات ہوتے ہیں‘ جنہیں خصوصی مراعات حاصل ہوتی ہیں اور خصوصی مفادات حاصل ہوتے ہیں۔ ان کے پاس سرمایہ ہوتا ہے جس سے وہ غنڈوں کو خرید سکتے ہیں۔ وہ اس سرمائے سے علمائے سوء کو خرید سکتے ہیں۔ لہٰذا یہاں کی جنگ بڑی پیچیدہ جنگ ہے اور اس میں جان کی بازی لگانے کا مرحلہ تو لازماً آ کر رہے گا۔ مسلمان کے خلاف ہتھیار اٹھانا اگرچہ مطلقاً خارج از بحث نہیں ہے‘ خصوصاً امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اگر دین کے غلبے کے لیے اس کی ضرورت پیش آئے اور اس کی شرائط پوری ہوگئی ہوں تو اس کی بھی اجازت ہے‘ لیکن وہ شرائط بڑی کڑی اور بہت سخت ہیں۔ وہ معاملہ بہرحال نہیں ہے جو کافروں کے خلاف ہتھیار اٹھانے کا ہے۔ دوسرے یہ کہ اِس دَور میں حکومتوں کے پاس وسائل‘ ذرائع اور قوت بے پناہ ہے اور شہری پہلے کے مقابلے میں بالکل نہتے ہیں۔ اس اعتبار سے بھی مسلمان حکومتوں کے خلاف جنگ اگرچہ ناممکن تو نہیں ہے‘ گوریلا جنگ ہوسکتی ہے‘ لیکن عملاً یہ بہت ہی مشکل ہے۔

اب ان دو حالتوں میں اقدام کے لیے ہمیں غور و فکر کر کے کوئی اور عنوان‘ کوئی اور راستہ اور طریقہ تلاش کرنا ہوگا۔ انسانی تمدن کے بتدریج ارتقاء کے نتیجے میں روشن خیالی (illumination) کی منازل طے کرتے ہوئے ہم جہاں پہنچے ہیں وہ ہے اصل میں اس درس کا موضوع اور اس کا عنوان۔ اب یہ راستہ اور طریقہ بھی ہمیں کہیں باہر سے نہیں تلاش کرنا۔ یہ پوری وضاحت کے ساتھ قرآن اور سنت رسول ؐ میں موجود ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا فضل و کرم ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ اسلام کے آخری اور کامل دین ہونے کی بہت بڑی دلیل ہے۔ اور یہ ہے درحقیقت فریضہ ’’نہی عن المنکر‘‘ جسے قرآن و حدیث میں بہت نمایاں کیا گیا ہے۔ حدیث میں نہی عن المنکر کے تین مراتب آئے ہیں۔ ان میں سب سے اونچا مرتبہ نہی عن المنکر بالید ہے۔

نوٹ کیجیے کہ زمانے نے جہاں مسلح اقدام کو بہت ہی مشکل بنا دیا ہے وہاں زمانے نے ایک متبادل طریقہ بھی پیدا کیا ہے۔ اس معاملے میں درحقیقت اس سیاسی ارتقاء (political evolution) کو سمجھنا ہوگا جو اکثر و بیشتر لوگوں کے سامنے نہیں ہے۔ انسان کے سیاسی شعور کے ارتقاء اور سیاسی اداروں کے ارتقاء سے آج یہ بات واضح ہوئی ہے کہ حکومت اور شے ہے‘ ریاست اور شے ہے۔ یہ بات آج سے دو سو برس پہلے بھی دنیا کو معلوم نہیں تھی۔ یہ بھی ایک انکشاف ہے اور ایک طرح کی ایجاد ہے۔ جیسے موٹر‘ ریل‘ ہوائی جہاز جیسی مادی ایجادات ہیں ویسے ہی یہ عمرانی ایجادات ہیں۔ مادی ایجادات کا تو ہم بھرپور فائدہ اٹھا رہے ہیں‘ جبکہ بدقسمتی سے اس عمرانی ایجاد کا فہم و شعور‘ خاص طور پر ہمارے رجالِ دین کے طبقے میں‘ موجود نہیں ہے۔ اس لیے کہ انہوں نے اس کا مطالعہ نہیں کیا‘ یہ ان کا موضوع نہیں ہے کہ جدید پولیٹیکل سائنس کیا ہے اور جدید تصورِ ریاست کیا شے ہے۔ آج کے دَور میں حکومت تو پہلے کے مقابلے میں ایک تہائی رہ گئی ہے‘ اصل شے اب ریاست ہے۔ شہری کی وفاداری ریاست سے ہوتی ہے‘ حکومت سے نہیں ہوتی۔ حکومت تو ریاست کے تین بنیادی اعضاء (organs) میں سے ایک ہے۔ یعنی مقنّنہ (Legislature)‘ عدلیہ (Judiciary) اور انتظامیہ (Executive) میں سے حکومت کے پاس صرف انتظامیہ کا کردار ہے‘ یعنی یہ صرف تنفیذی اور انتظامی قوت ہے‘ جبکہ قانون سازی کا ادارہ اور ہے‘ عدلیہ کا ادارہ اور ہے۔ مزید یہ کہ ہر شہری کا یہ حق تسلیم کیا گیا ہے کہ وہ حکومت کی تشکیل میں رائے دے اور ناپسندیدہ حکومت کو بدل دے۔ جماعت سازی بھی اس کا حق مانا گیا ہے‘ اس لیے کہ اگر وہ جماعت نہیں بنائے گا تو قوت کیسے وجود میں آئے گی؟ اور اجتماعی قوت کے بغیر وہ حکومت کو کیسے بدلے گا اور وسائل و ذرائع کو کیسے مجتمع کرے گا کہ اپنے فکر کو لوگوں کے سامنے لا سکے؟ حکومت کی تبدیلی کا ایک جمہوری طریق کار ہے اور ایک انقلابی طریق کار۔ لیکن جماعت سازی اور اظہارِ رائے بہرحال شہری کے وہ حقوق ہیں جن پر کوئی قدغن نہیں لگائی جا سکتی۔ یہ جو

دارے (institutions) وجود میں آئے ہیں انہوں نے ان راستوں کو اَب کھول دیا اور آسان کر دیا ہے۔ گویا تمدنی ارتقاء نے ایک دروازہ بند کیا ہے تو دوسرا دروازہ کھول دیا ہے۔ آدمی کو اگر ان چیزوں کا شعور نہ ہو تو بھی وہ شش و پنج میں مبتلا ہو کر رہ جاتا ہے کہ مسلمانوں کے معاشرے میں کیا کرے اور کیسے کرے؟ تو ان تمام چیزوں کو سامنے رکھنا ہوگا۔ درحقیقت اس سیاق و سباق میں نہی عن المنکر کی جو اہمیت قرآن و حدیث سے ہمارے سامنے آتی ہے اس کو سمجھنے کے لیے اس منتخب نصاب (۲) میں اس درس کو شامل کیا گیا ہے۔

☆ ☆ ☆

اس درس میں سورۂ آل عمران کی تین آیات (۱۰۲ تا ۱۰۴) شامل کی گئی ہیں، جن میں سے اس درس کی ترکیب کے اعتبار سے صرف آخری اور مختصر آیت (۱۰۴) متعلق ہے:

﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴾

اسی طرح سورۃ التوبۃ کی دو آیات میں سے آیت ۱۱۲ اِس موضوع سے متعلق ہے۔ اس میں اہل ایمان کے نو اوصاف بیان ہوئے ہیں، جن میں سے آخری تین اوصاف کا تعلق اصل میں اس موضوع سے ہے: ﴿الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ؕ﴾ اس سے ماقبل آیت ۱۱۱ کا مطالعہ ہم گزشتہ درس میں کر چکے ہیں کہ اس آیت سے درحقیقت بیع اور پھر بیع سے بیعت کا تصور اجاگر ہوا ہے۔ ان دونوں آیتوں کا باہمی ربط یہ ہے کہ آیت ۱۱۲ میں اہل ایمان کے جو اوصاف بیان کیے جا رہے ہیں ان میں سے یہ جو آخری تین اوصاف ہیں ان کے لیے قوت درکار ہے۔ اور اس قوت کے لیے وہ لوگ درکار ہیں جو اللہ سے وہ بیع و شراء کر چکے ہوں جو آیت ماقبل میں مذکور ہے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ﴾ "یقیناً اللہ تعالیٰ نے مؤمنین سے خرید لی ہیں ان کی جانیں اور مال جنت کے عوض"۔ اس لیے یہاں پر اس آیت کو بھی شامل کیا گیا۔

اُمّتِ مسلمہ کے لیے سہ نکاتی لائحہ عمل

جہاں تک سورۂ آل عمران کی تین آیات (۱۰۲ تا ۱۰۴) کا تعلق ہے، یہ نوٹ کر لیجیے کہ یہ مقام بھی قرآن مجید کے جامع ترین مقامات میں سے ہے اور ان میں اُمتِ مسلمہ کے لیے تین نکات پر مشتمل ایک مکمل لائحہ عمل دے دیا گیا ہے۔ یہ درس اصلاً تو ہمارے منتخب نصاب کے حصہ اوّل (جامع اسباق) میں شامل ہونا چاہیے اور سورۃ العصر، آیۃ البر، سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع، سورۂ حٰم السجدۃ کی آیات ۳۰ تا ۳۶ کے ساتھ آنا چاہیے کہ یہ بالکل اسی معیار اور اسی سطح کا اور اتنی ہی جامعیت کا حامل مقام ہے۔ اس کی پہلی آیت ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴾ میں جو چیز ایک فرد سے مطلوب ہے اس کو انتہائی جامعیت، انتہائی اختصار اور انتہائی تاکید سے بیان کر دیا گیا ہے اس آیت میں۔ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ سے خطاب ہے۔ تو گویا سورۃ العصر کا "اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا" خود بخود اِس میں آ گیا۔ اور "وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ" کے لیے اس آیت میں جامع ترین، مؤکد ترین، خوبصورت ترین اور مختصر ترین تعبیر ہے کہ "اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جتنا کہ اس کا حق ہے"۔ میرے نزدیک یہ آخری تاکیدی اسلوب ہو سکتا ہے اور یہ ناممکن الحصول ہے۔ اس مقام تک کوئی انسان نہیں پہنچ سکتا۔ لیکن اصول بہر حال یہی ہے۔ یعنی آئیڈیل اونچا ہونا چاہیے، نگاہ بلند ہونی چاہیے۔ اب جہاں تک کوئی رسائی حاصل کر سکے یہ اس کی ہمت ہے، البتہ اصول واضح رہنا چاہیے۔ یہ حکم سن کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم گھبرا گئے تھے کہ حضور (ﷺ)! کس کے لیے ممکن ہے اللہ کا حقِ تقویٰ ادا کرنا! پھر جب سورۃ التغابن کی یہ آیت نازل ہوئی کہ ﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ (آیت ۱۶) "اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جتنا تم استطاعت رکھتے ہو"، تو اُن کی جان میں جان آئی۔ حالانکہ سورۃ البقرۃ کے اندر بھی یہ مضمون موجود ہے: ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ﴾ (آیت ۲۸۶) لیکن اس کو مزید واضح کرنا اطمینان کے لیے ضروری تھا۔

اس آیت میں دوسرا حکم ہے: ﴿وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴾ "اور (دیکھو اہل ایمان!) ہرگز مت مرنا، مگر حالت اسلام میں"۔ بدقسمتی یہ ہے کہ اس میں اسلام کے جب اصطلاحی معنی مراد لے لیے جاتے ہیں تو اس آیت کی ساری جان نکل جاتی ہے۔ جان لیجیے یہاں اصطلاحی اور فقہی معانی مراد نہیں ہیں۔ یہاں "مسلم" کے اصل لغوی معنی مراد ہیں کہ "تمہیں ہرگز موت نہ آئے مگر حالت فرماں برداری میں"۔ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ﴾ کے انتہائی گاڑھے حکم کے ساتھ یہاں پر "اسلام" کا فقہی مفہوم ہرگز مراد نہیں ہو سکتا۔ یہ اس حکم سے قطعاً مناسبت نہیں رکھتا۔ جن لوگوں کے ذہنوں میں توازن نہیں ہوتا وہ اس طرح بھٹکتے ہیں۔

اب اس بحث کو چھوڑ دیجیے کہ گناہِ کبیرہ سے بھی کوئی شخص کافر ہوتا ہے یا نہیں ہوتا۔ یہ قانونی بحث ہے۔ اس دنیا میں آپ کسی کے اوپر کوئی فتویٰ نہیں لگا سکتے۔ یہاں وہ حدیث نبویؐ ذہن میں رکھیے: ((لَا يَزْنِى الزَّانِىْ حِيْنَ يَزْنِىْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ، وَلَا يَسْرِقُ السَّارِقُ حِيْنَ يَسْرِقُ وَهُوَ مُؤْمِنٌ، وَلَا يَشْرَبُ الْخَمْرَ حِيْنَ يَشْرَبُهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ)) (۱) "کوئی زانی حالتِ ایمان میں زنا نہیں کرتا، اور کوئی چور حالتِ ایمان میں چوری نہیں کرتا اور کوئی (شراب پینے والا) حالتِ ایمان میں شراب نہیں پیتا"۔ حقیقت کے اعتبار سے یہاں یہی مفہوم مراد ہے کہ "ہرگز مت مرنا مگر حالت فرماں برداری میں"۔ جب آدمی گناہ کر رہا ہے تو اُس وقت وہ فرماں بردار کہاں ہے! وہ تو فرمان کو توڑ رہا ہے۔ اس

حالت میں موت بڑی عبرت ناک اور حسرت ناک موت ہے۔ بالفرض ایک شخص کی عین عملِ زنا کے دوران جان سلب کر لی جائے تو تصور کیجیے یہ کتنی عبرت ناک موت ہوگی! لیکن اب یہ بھی جان لیجیے کہ یہ عملِ زنا تو ہمیں طبعاً بہت ہی بُرا لگتا ہے‘ اس لیے کہ اسے برا سمجھنا ہماری روایت کا ایک جزو بن گیا ہے‘ یہ ہمارے اجتماعی شعور (collective consciousness) کا ایک جزوِ لاینفک ہوگیا ہے‘ جبکہ اس سے سوگنا برا عمل سود ہے۔ اب سود کھاتے ہوئے مرنا‘ اس تصور پر ہمیں جھرجھری نہیں آتی اور ناگواری محسوس نہیں ہوتی‘ حالانکہ یہ زنا سے سوگنا زیادہ برا عمل ہے‘ بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ۔ ایک حدیث نبویؐ کے الفاظ ہیں: ((اَلرِّبَا سَبْعُوْنَ حُوْبًا‘ اَیْسَرُھَا اَنْ یَنْکِحَ الرَّجُلُ اُمَّہٗ))[۲] ”سود کے ستر حصے ہیں‘ ان میں سے سب سے ہلکا یہ ہے کہ آدمی اپنی ماں سے نکاح کرے“۔ اس حدیث کی روشنی میں عملِ زنا اور عملِ سود میں کیا نسبت قائم ہوسکتی ہے! ہزار گنا بھی کہا جائے تو کم ہے۔ اب یہاں جو لفظ آیا ہے: ”وَلَا تَمُوْتُنَّ“ ”دیکھنا تمہیں موت نہ آئے“ اس کا کیا مطلب ہوا؟ یہ حکم گویا اس حکم کے ہم پلہ ہوگیا ہے کہ: ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقٰتِہٖ﴾۔ اب ایک ایک لمحہ جاگ کر اور چوکس اور چوکنے رہ کر بسر کرنا ہے کہ کہیں کوئی لمحہ حالتِ معصیت میں نہ گزرے۔ کیا کوئی ضمانت ہے کسی کے پاس کہ اسی لمحے اس کی موت نہیں آسکتی؟

اب اس سے آگے آیئے! افراد کو جمع کر کے ان کی شیرازہ بندی سے ایک قوت وجود میں آتی ہے۔ دیکھئے مسلمانوں کی یہ شیرازہ بندی کس بنیاد پر ہے؟ ان کو جوڑنے والی شے کون سی ہے؟ یہ چیز ”حبلُ اللہ“ ہے‘ یعنی قرآن مجید۔ فرمایا: ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا﴾ ”سب مل کر اللہ کی رسی کو تھام لو“۔ سورۃ الحج میں الفاظ آئے ہیں: ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰہِ﴾ ”اللہ کے ساتھ چمٹ جاؤ“۔ بڑا خوبصورت ربط ہے ان دونوں کے مابین۔ عَصَمَ‘ یَعْصِمُ کے معنی ہیں ”کسی کو بچانا“۔ جیسے حضور ﷺ سے فرمایا گیا: ﴿وَاللّٰہُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ ط﴾ (المائدۃ:٦٧) ”(اے نبی!) اللہ آپ کو بچائے گا (آپ کی حفاظت فرمائے گا) لوگوں سے“۔ بابِ افتعال سے مصدر بنتا ہے اِعتِصام۔ اس کا مطلب ہے ”خود بچنا‘ اپنا تحفظ حاصل کرنا“۔ اس کے ساتھ حرف ”ب“ کا صلہ لگنے سے یہ متعدی ہوجاتا ہے کہ اس بچاؤ کا ذریعہ کیا چیز بنے گی؟ فرمایا: ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰہِ﴾ ”چمٹ جاؤ اللہ سے“ یعنی اللہ کے دامن سے وابستہ ہوجاؤ! اب ان الفاظ میں جو ایک اجمال ہے اس کی وضاحت ہے بایں الفاظ: ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ﴾ کہ اپنے تحفظ کے لیے اللہ کی رسی کے ساتھ چمٹ جاؤ!

اس حوالے سے مَیں بے شمار مقامات پر تفصیلی بحث کر چکا ہوں کہ حبل اللہ (اللہ کی رسی) سے کیا مراد ہے! الفاظ عام ہیں۔ ان سے توحید‘ دین‘ شریعت‘ کلمۂ شہادت وغیرہ سبھی چیزیں مراد لی جاسکتی ہیں۔ لیکن جب ہمارے پاس مرفوع تفسیر موجود ہو تو کسی اور طرف جانا درست نہیں ہے۔ حضور ﷺ نے حبل اللہ کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ قرآن ہے۔ حدیث نبویؐ کے الفاظ ہیں: ((اَلَا وَاِنِّیْ تَارِکٌ فِیْکُمْ ثَقَلَیْنِ‘ اَحَدُھُمَا کِتَابُ اللّٰہِ عَزَّوَجَلَّ ھُوَ حَبْلُ اللّٰہِ......))[۱] ”آگاہ رہو کہ میں تمہارے درمیان دو بھاری چیزیں چھوڑے جارہا ہوں‘ ان میں سے ایک اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے‘ یہ اللہ کی رسی ہے“۔ ایک دوسری حدیث میں آیا ہے: ((ھُوَ حَبْلُ اللّٰہِ الْمَتِیْنُ))[۱] ”یہی (قرآن مجید) اللہ کی مضبوط رسی ہے“۔ نیز فرمایا: ((کِتَابُ اللّٰہِ حَبْلٌ مَمْدُوْدٌ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ))[۲] ”اللہ کی کتاب آسمان سے زمین تک تنی ہوئی ایک رسّی ہے“۔ تو اب یہ قرآن ہی اصل شے ہے۔ اب چمٹو قرآن کے ساتھ! اعتصام بالقرآن ہونا چاہیے۔ اعتصام بالقرآن کے دونوں پہلو اِس میں موجود ہیں جو تفصیل سے بیان ہو چکے ہیں۔ یعنی تزکیہ بھی ہوگا تو اسی قرآن سے‘ دعوت بھی دی جائے گی تو اسی قرآن سے۔ جیسے فرمایا گیا ہے: ﴿یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْکُمْ مَّوْعِظَۃٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ وَھُدًی وَّرَحْمَۃٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۵۷﴾﴾ (یونس) ”اے لوگو! تمہارے پاس آچکی ہے نصیحت تمہارے ربّ کی طرف سے اور یہ شفاء ہے دل کی بیماریوں کی اور اہلِ ایمان کے لیے راہنمائی اور رحمت ہے“۔ اس سے بڑا معجزہ کوئی نہیں ہے۔ انسان کے نفس کے اندر جو روگ ہوتے ہیں‘ جیسے حبّ جاہ‘ حبّ دنیا‘ حبّ مال‘ ان کے ازالے اور ان کے معالجے کے لیے اس سے بڑی دوا کوئی نہیں۔ پھر یہ کہ دعوت اور تذکیر کا ذریعہ بھی یہ قرآن ہے۔ فرمایا: ﴿فَذَکِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ یَّخَافُ وَعِیْدِ ﴿۴۵﴾﴾ (قٓ) ”(اے نبیؐ!) اس قرآن کے ذریعے یاددہانی کرایئے اس کو جو میری تنبیہہ سے ڈرتا ہو“۔ یعنی انذار بھی اسی قرآن کے ذریعے اور تبشیر بھی اسی قرآن کے ذریعے۔ تو یہ اعتصام دونوں اعتبارات سے ہے۔

”جَمِیْعًا“ کے لفظ کے لیے یہاں دونوں امکانات موجود ہیں۔ ”جَمِیْعًا“ قرآن کا حال بھی ہوسکتا ہے اور مخاطبین کا بھی۔ یعنی یہ مفہوم بھی ہوسکتا ہے کہ پورے قرآن کو تھامو! ایسا نہ ہو کہ ؎

اڑائے کچھ ورق لالے نے‘ کچھ نرگس نے‘ کچھ گل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری!

بلکہ پورے کے پورے قرآن کو اختیار کرو۔ اہل کتاب کو اُن کی اسی روش پر سرزنش کی گئی ہے۔ فرمایا: ﴿اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْکِتٰبِ وَتَکْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ج﴾ (البقرۃ:٨٥) ”کیا تم کتاب کے کچھ حصے کو مانتے ہو اور کچھ کا انکار کرتے ہو؟“ تو اے مسلمانو! تمہاری یہ روش نہیں ہونی چاہیے۔ ویسے عام طور پر ”جَمِیْعًا“ سے دوسرا مفہوم مراد لیا گیا ہے کہ

’’سب مل جل کر اللہ کی مضبوط رسی کو تھام لو‘‘۔ اس سے اب ایک جمعیت وجود میں آ گئی۔ یہ مقام مُحْتَمِلِ المَعنَيَين ہے‘ یعنی اس میں دونوں معانی کا احتمال ہے‘ اور دونوں اپنی جگہ مقصود بھی ہیں اور مطلوب بھی۔ یہی ہے اعجازِ کلام اور یہی ہے فصاحت اور بلاغت کا نقطۂ عروج۔ تو اب ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا﴾ میں دونوں باتیں آ گئیں‘ لیکن اس کے بعد والے الفاظ ﴿وَلَا تَفَرَّقُوْا﴾ کے ساتھ یہ دوسرا مفہوم زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ ’’لَا تَفَرَّقُوْا‘‘ باب تفعّل سے جمع مخاطب کے لیے صیغۂ نہی ہے اور اس میں عام طور پر ایک ’’ت‘‘ گر جاتی ہے۔ سورۃ الشوریٰ میں یہ لفظ آ چکا ہے: ﴿اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ﴾ ’’کہ دین کو قائم کرو اور دین کے باب میں متفرق نہ ہو جانا‘‘۔ تو یہاں بھی اصل میں لفظ وہی ہے‘ لیکن قواعدِ صرف کی رو سے باب تفعّل میں کبھی ایک ’’ت‘‘ گرا دی جاتی ہے۔ ﴿وَلَا تَفَرَّقُوْا﴾ آپس میں متفرق مت ہونا‘ بٹ نہ جانا‘ ٹکڑوں میں تقسیم نہ ہو جانا۔

اب اس کے بعد ایک خالص تاریخی حقیقت کی طرف اشارہ ہے ان الفاظ میں:

﴿وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ج﴾

’’اور یاد کرو اپنے اوپر اللہ کی اس نعمت کو جبکہ تم (ایک دوسرے کے) دشمن تھے‘ تو اس نے تمہارے دلوں کے مابین محبت ڈال دی تو تم اس کی اس نعمت کے سبب آپس میں بھائی بھائی ہو گئے‘‘۔

یہاں صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا جا رہا ہے کہ تم ذرا اپنے ماضی کو یاد کرو کہ تم آپس میں کتنے بٹے ہوئے تھے‘ کتنے منقسم تھے! جان لیجیے پورے عرب میں کوئی نظام نہیں تھا۔ حالیؔ نے اس کا نقشہ یوں کھینچا ہے۔

کہیں پانی پینے پلانے پہ جھگڑا
کہیں گھوڑا آگے بڑھانے پہ جھگڑا!

چھوٹی چھوٹی باتوں پر لمبی لمبی جنگیں چلتی تھیں۔ خاص طور پر قبیلہ اَوس اور قبیلہ خزرج کے مابین کب سے جنگ چلی آ رہی تھی! جیسے ہمارے ہاں قتل اور خون ریزی کے قبائلی اور خاندانی واقعات نسل در نسل چلتے ہیں‘ تو وہاں بھی کشت و خون کا بازار گرم تھا۔ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے فرمایا جا رہا ہے کہ تم تباہی کے آخری کنارے تک پہنچ چکے تھے۔ ﴿وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ط كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿١٠٣﴾﴾ ’’اور (یاد کرو اللہ کی اس نعمت کو) جبکہ تم آگ کے گڑھے کے کنارے پر تھے تو اس نے تمہیں اس سے بچا لیا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہارے لیے اپنی آیات کو واضح فرماتا ہے تاکہ تم ہدایت حاصل کرو‘‘۔ اب اس میں آپ تفصیل‘ تبیین‘ وعظ اور نصیحت کا جتنا چاہیں رنگ بھر لیں‘ لیکن اس وقت میں اشارات پر اکتفا کر رہا ہوں۔

نوٹ کیجیے کہ اب یہاں سے دوسرا مرحلہ شروع ہو رہا ہے۔ اس مرحلے میں میرے نزدیک اصل شے جمعیت ہے کہ سب مل جل کر اس رسی کو مضبوطی سے تھام لو۔ اس میں تبعاً وہ مفہوم بھی شامل ہے کہ اصل میں دعوت اور تزکیہ کا ذریعہ حبل اللہ یعنی قرآن ہے۔ اقبال کی جو عزت میری نگاہ میں ہے اس کا ایک بہت اہم سبب یہ ہے کہ ان مفاہیم کو جس خوبصورتی سے اس نے ادا کیا اس کی کہیں مثال نہیں ملتی۔ قرآن کے بارے میں کہتے ہیں۔

از یک آئینی مسلماں زندہ است
پیکر ملت ز قرآں زندہ است
ما ہمہ خاک و دلِ آگاہ اوست
اعتصامش کن کہ حبل اللہ اوست!

’’وحدتِ آئین ہی مسلمان کی زندگی کا اصل راز ہے اور ملتِ اسلامی کے جسدِ ظاہری میں روحِ باطنی کی حیثیت صرف قرآن کو حاصل ہے۔ ہم تو سرتاپا خاک ہی خاک ہیں‘ اور ہمارا قلب زندہ اور ہماری روح تابندہ دراصل قرآن ہی ہے۔ لہٰذا اسے مضبوطی سے تھام لو کہ یہی اللہ کی رسی ہے!‘‘

اب تیسری بات آ رہی ہے‘ جو ہمارے اس درس سے متعلق ہے۔ فرمایا: ﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ﴾ ’’تم میں سے ایک ’’اُمت‘‘ ہونی چاہیے‘‘۔ یہاں ’’اُمَّةٌ‘‘ کا لفظ قابلِ غور ہے۔ اَمَّ‘ يَؤُمُّ کے معنی ہیں قصد کرنا۔ جیسے سورۃ المائدۃ میں الفاظ آئے ہیں: ﴿آٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ﴾ ’’وہ جو بیت حرام کا قصد کر کے چل رہے ہیں‘‘۔ اسی طرح ’’اُمت‘‘ افراد کا وہ مجموعہ ہے جنہیں ایک مقصد باندھ لیتا ہے۔ اُمت کسی نسل‘ زبان یا علاقے کی بنیاد پر نہیں بنتی۔ البتہ ’’قوم‘‘ کے لیے یہ چیزیں بنیاد بن سکتی ہیں۔ قرآن مجید میں ان کی نفی نہیں کی گئی ہے‘ لیکن ’’قوم‘‘ کا لفظ قرآن میں ’’اُمت‘‘ کے معنی میں نہیں آیا۔ ’’قوم‘‘ کا لفظ کسی قبیلے یا کسی علاقے کے رہنے والوں کے لیے مستعمل ہے۔ مولانا مودودی نے اس اعتبار سے صحیح کہا تھا کہ ’’مسلمان قوم نہیں ہیں‘‘۔ اصل میں دو باتیں علیحدہ علیحدہ ہیں۔ ہندو کے مقابلے میں تو مسلمان ایک قوم ہیں۔ جب ایک مشترک وطنی قومیت کا تصور پیش کیا

گیا تو اس کے جواب میں یہ کہنا کہ نہیں' ہندو اور مسلمان ایک قوم نہیں ہیں' دو الگ الگ قومیں ہیں' یہ بات درست تھی۔ اس لیے کہ بات کہنے کے مختلف درجے ہوتے ہیں۔ لیکن یہ بات بلند تر ہے کہ ''مسلمان ایک قوم نہیں ہیں''۔ اس لیے کہ وہ تو ایک جماعت ہیں' ایک اُمت ہیں' حزبُ اللہ ہیں۔ البتہ ہمارے زوال اور اضمحلال کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ہم جماعت' حزب اور اُمت نہیں رہے' بلکہ ایک قوم بن گئے۔ یہ ہے اصل میں اس پوری بحث کا لُبّ لباب۔ چنانچہ مولانا مودودی کی بات صد فی صد صحیح تھی' اگرچہ de facto صورت میں اُس وقت جو خطرات تھے ان کے پیشِ نظر ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں کے ایک قوم ہونے کا شعور دلانا بھی ضروری تھا۔ بہرحال مسلمانوں کی ہیئت اجتماعیہ کے لیے پورے قرآن میں کہیں لفظ ''قوم'' نہیں آیا۔ قرآن میں یہ لفظ سابقہ انبیاء ورُسل کی دعوت کے ضمن میں آیا ہے کہ: یَا قَوْمِ' یَا قَوْمِ۔ اس لیے کہ واقعہ یہی ہے کہ وہ اپنی قوموں ہی کی طرف مبعوث ہوئے تھے' اور وہ بین الاقوامیت اور آفاقیت حضور ﷺ سے پہلے کسی رسول کی دعوت میں نہیں تھی۔ طبعی طور پر (physically) ابھی یہ ممکن بھی نہیں تھا' کیونکہ ابھی وسائل وذرائع اتنے نہیں تھے لہٰذا اُن کا دائرۂ دعوت اپنی اپنی قوم تک محدود تھا۔ جیسے فرمایا گیا: ﴿وَاِلٰی عَادٍ اَخَاھُمْ ھُوْدًا﴾ اور ﴿وَاِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاھُمْ صٰلِحًا﴾ (ھود) چنانچہ ان کی دعوت میں یٰقَوْمِ کا لفظ مستعمل ہے۔ جبکہ قرآن میں خطاب ''یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ'' اور ''یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا'' سے ہوتا ہے۔ لفظ ''اُمت'' کا مطلب' جیسا کہ میں نے عرض کیا' ہم مقصد' ہم ارادہ اور ہم سفر ساتھیوں کا ایک مجموعہ ہے۔ اس کے لیے قرآن کا دوسرا لفظ ''حزب'' ہے جو اِس منتخب نصاب نمبر۲ میں بیان ہو چکا ہے کہ ایک حزب الشیطان ہے اور دوسرا حزب اللہ۔

اب یہاں لفظ ''مِنْ'' پر غور کریں۔ ''مِنْ'' کے یہاں دو امکانات ہیں' ایک ''مِنْ بیانیہ'' اور دوسرا ''مِنْ تبعیضیہ''۔ یہاں اگر مِن تبعیضیہ مراد لیں گے تو ''بعض'' اور ''جزو'' کے معنی پیدا ہو جائیں گے اور عام طور پر زیادہ تر یہی مفہوم سمجھا گیا ہے۔ لیکن مولانا ابوالکلام آزاد نے ایک بڑی زوردار تحریر لکھی تھی کہ یہاں مِن تبعیضیہ نہیں ہے' بلکہ مِن بیانیہ ہے۔ دیکھئے تبعیضیہ ماننے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ سب کے کرنے کا کام لازمی نہیں رہتا' بلکہ یہ ایک فرضِ کفایہ بن جاتا ہے کہ تم میں سے کچھ لوگ ہونے چاہئیں' کچھ لوگ رہنے چاہئیں جو یہ کام کریں۔ اصل میں اس مفہوم کی نفی کے لیے انہوں نے اس کو مِن تبعیضیہ ماننے سے انکار کر دیا۔ اس لیے کہ وہ مسلمانوں کو زوردار دعوت دینا چاہتے تھے کہ یہ ایمان کا عین تقاضا ہے' جبکہ مِن تبعیضیہ ماننے سے یہ مغالطہ ہو گیا ہے کہ یہ فرضِ کفایہ ہے کہ کچھ لوگ تم میں سے یہ کام کر دیں تو یہ فرض ادا ہو جائے گا۔ لہٰذا انہوں نے اسے مِن بیانیہ کہا ہے اور ﴿وَلْتَکُنْ مِّنْکُمْ اُمَّۃٌ﴾ کا مفہوم یہ لیا ہے کہ ''تم سے ایک ایسی اُمت وجود میں آنی چاہیے''۔ ''تم میں سے'' نہیں ''تم سے''۔ یہ مِن بیانیہ کا مفہوم ہے۔ جیسے میں بیان کر چکا ہوں' سورۃ الفتح کی آخری آیت میں بھی یہ بحث موجود ہے۔ فرمایا: ﴿وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْھُمْ مَّغْفِرَۃً وَّاَجْرًا عَظِیْمًا ﴿۲۹﴾﴾ ''اللہ نے وعدہ کیا ہے اُن لوگوں سے جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک اعمال کیے' مغفرت کا اور بہت بڑے اجر کا''۔ میں واضح کر چکا ہوں کہ اس آیت میں مِن تبعیضیہ نہیں' بیانیہ ہے۔ صحابۂ کرام ؓ کی پوری جماعت سے اللہ کا یہ وعدہ ہے۔ اگر تبعیضیہ مانیں گے تو مِنْکُمْ سے تبعیض ہو جائے گی اور ذہن کو شیعیت کی طرف منتقل کرنے کے لیے ایک بہانہ بن جائے گا۔ وہی معاملہ یہاں ہے' لیکن میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ اس امکان کو خارج نہیں کیا جا سکتا کہ یہ مِن تبعیضیہ ہو۔

اب اس کا حل کیا ہو گا؟ اس کا جواب اسی سورۂ مبارکہ کی آیت ۱۱۰ میں بایں الفاظ آ گیا ہے: ﴿کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ﴾ ''تم بہترین اُمت ہو جو لوگوں کے لیے نکالی گئی ہے''۔ اب اگر کوئی مغالطہ ہو سکتا تھا تو وہ نکل گیا۔ پوری اُمت سے کہا گیا ہے کہ ''تم وہ بہترین اُمت ہو جسے دنیا والوں کے لیے نکالا گیا ہے''۔ مزید فرمایا: ﴿تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ ط﴾ ''تم (لوگوں کو) نیکی کا حکم دیتے ہو اور منکر سے روکتے ہو اور تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو''۔ لہٰذا اگر یہاں (آیت ۱۰۴ میں) ''مِن تبعیضیہ'' مان کر کسی کمی کا پہلو آ جاتا ہے تو اس سے اس کی تلافی ہو گئی' اس تصور کا راستہ بند ہو گیا۔ اور اگر ''مِن بیانیہ'' ہو تو یہ دونوں آیتیں (آیت ۱۰۴ و ۱۱۰) بالکل ہم معنی ہو جائیں گی۔ جیسے کہا جاتا ہے: لِلْاَمِیْرِ مِنْ اَوْلَادِہٖ جُنْدٌ کہ امیر کی تو اولاد ہی سے ایک لشکر وجود میں آ گیا ہے' اسے کسی اور لشکر کی ضرورت ہی نہیں۔ اگر اللہ نے اسے سو بیٹے دے دیے ہوں تو لشکر تو بن گیا۔ پچھلے زمانے میں تو ایک شخص کے سو بیٹے ہو سکتے تھے۔ تو یہاں پر ''مِن تبعیضیہ'' نہیں ہے' بلکہ ''مِن بیانیہ'' ہے۔ اسی کو مولانا ابوالکلام آزاد دلیل کے طور پر لائے ہیں کہ لِلْاَمِیْرِ مِنْ اَوْلَادِہٖ جُنْدٌ۔ درحقیقت پوری اُمت کے سامنے ایک مقصد اور ایک ہدف رکھا جا رہا ہے کہ تم سے اب ایک اُمت وجود میں آنی چاہیے۔ تمہیں جو آپس میں اینٹوں کے مانند جوڑ کر ایک دیوار بنائی جا رہی ہے تو اسی مقصد کے لیے۔ پہلے ایک فرد کا معاملہ تھا۔ فرمایا گیا: ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقٰتِہٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾﴾ پھر ان افراد کی شیرازہ بندی کے لیے حبل اللہ دے دی گئی۔ اب شیرازہ بندی خود مطلوب ومقصود تو نہیں ہے' جماعت خود کوئی مطلوب ومقصود شے نہیں ہوا کرتی' جماعت تو کسی ہدف اور کسی مقصد کے لیے وجود میں آتی ہے۔ اب وہ مقصد کیا ہے؟ یہ مقصد ہے جو اس سلسلے کی تیسری آیت (آیت ۱۰۴) میں بیان ہوا ہے: ﴿وَلْتَکُنْ مِّنْکُمْ اُمَّۃٌ یَّدْعُوْنَ اِلَی الْخَیْرِ......﴾ ''تم سے — یا بالفاظ دیگر تم میں سے — وجود میں آنی چاہیے ایک اُمت جو (لوگوں کو) بھلائی کی طرف بلائے......!''

اس میں ایک تطبیق اور بھی ہے۔ ایک لحاظ سے تو اس پوری اُمت کو یہ کام کرنا ہے۔ یہ تو ہمیں دَورِ صحابہؓ میں نظر آتا ہے۔ لیکن اس دورِ زوال میں کیا ہوگا؟ اب پوری اُمت تو اس کام پر قائم نہیں۔ عملی طور پر بھی یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک دم پوری اُمت کو اس کام پر آمادہ کر دیا جائے، جبکہ لوگ سوئے ہوئے ہیں۔ اس صورت حال میں ''مِنْكُمْ'' میں ''مِن تبعیضیہ'' نکھر کر سامنے آ رہا ہے کہ ''تم میں سے ایک گروہ تو ایسا ہونا ہی چاہیے''۔ اب یہ گروہ جاگے، منظم ہو، دوسروں کو جگائے۔ یہ پراسیس تو اسی طرح شروع ہوگا۔ یوں سمجھئے کہ پہلے وہ نیوکلیئس وجود میں آئے گا تو اس کے گرد مختلف الیکٹرانز آئیں گے اور وہ ایٹم بڑھتا چلا جائے گا۔ اگر نیوکلیئس ہی نہ ہو تو ایٹم کہاں سے وجود میں آئے گا؟ لہٰذا وہاں مِن تبعیضیہ کا ایک بہت خوبصورت مفہوم سامنے آتا ہے۔ یعنی ''تم میں سے ایک اُمت تو رہنی ہی چاہیے''۔ ایسا تو نہ ہو کہ اس کام کے لیے کوئی نہ رہے۔ اس کے ساتھ اس حدیث کو جوڑ لیجیے جس میں یہ خبر دی گئی ہے کہ: ((لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِّنْ اُمَّتِیْ ظَاهِرِیْنَ عَلَی الْحَقِّ))[1] ''میری اُمت میں ایک گروہ تو ہمیشہ رہے گا جو حق پر قائم ہوگا''۔ یوں کہنا چاہیے کہ یہ ایک طرح کی حضور ﷺ نے ضمانت دی ہے۔

اسلامی جماعت کے کرنے کا اصل کام

اب وہ گروہ کیا کام کرے! فرمایا: ﴿يَدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ﴾ ''وہ دعوت دیں خیر کی طرف''۔ یہ بہت جامع لفظ ہے۔ آگے فرمایا: ﴿وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ ''اور وہ معروف کا حکم دیں اور منکر سے روکیں''۔ ''دعوت الی الخیر'' اور ''امر بالمعروف ونہی عن المنکر'' کی اصطلاحات کو اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں قرآن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر تو ایک وحدت ہے، یہ ایک باقاعدہ قرآنی اصطلاح ہے۔ قرآن مجید میں نو مقامات پر یہ بالکل اسی طرح جڑ کر آیا ہے۔ حضور ﷺ کے لیے سورۃ الاعراف میں فرمایا گیا: ﴿يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ (آیت ۱۵۷) ''وہ انہیں معروف کا حکم دیتا ہے اور منکر سے روکتا ہے''۔ اہل کتاب میں سے جو اچھے لوگ تھے ان کی مدح ہوئی ہے ان الفاظ میں: ﴿وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ (آل عمران: ۱۱۴) ''اور وہ نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں''۔ اہل ایمان کے لیے سورۂ آل عمران میں دو مرتبہ یہ اسی طرح جڑ کر آ چکا ہے، ایک مرتبہ آیت ۱۰۴ میں، اور دوسری مرتبہ آیت ۱۱۰ میں بایں الفاظ: ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ سورۃ التوبۃ کی آیت ۱۱۲ میں بھی یہ جڑ کر آیا ہے۔ فرمایا: ﴿اَلْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ ''(وہ ہیں) نیکی کا حکم دینے والے اور برائی سے روکنے والے''۔

میں نے ایک مرتبہ ''نہی عن المنکر کی خصوصی اہمیت'' کے موضوع پر تقریر میں وہ نو مقامات گنوا دیے تھے جہاں یہ ایک وحدت کی شکل میں بالکل جڑ کر آیا ہے۔ (یہ خطاب ہماری کتاب ''اُمت مسلمہ کے لیے سہ نکاتی لائحہ عمل'' میں شامل ہے!) جیسے گاڑی کے دو پہیے باہم ایک دوسرے سے مربوط ہوتے ہیں ویسے ہی یہ دو اجزائے لاینفک ہیں اور ایک ہی حقیقت کے اور ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں، ان کو جدا کر دینا قرآن پر اور اسلام پر بہت بڑا ظلم ہے اور دین کے بنیادی تصورات کی گویا شکست وریخت ہے۔ البتہ ان دونوں (امر بالمعروف ونہی عن المنکر) کو بریکٹ کر کے ''دعوت الی الخیر'' کے ساتھ جمع کیجیے۔ اب یہاں حرفِ عطف ''وَ'' ''دعوت الی الخیر'' اور ''امر بالمعروف ونہی عن المنکر'' کے درمیان مغائرت کرے گا۔ اب یہ سمجھ لیجیے کہ یہ مغائرت کیا ہے! دیکھئے دعوت کی اصل روح سوز، ہمدردی، نصح وخیر خواہی اور اپیل کا انداز ہے۔ اس میں خوشامد ہے، جبکہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر میں قوت کا اظہار ہے، اختیار ہے اور وعظ ونصیحت کا نہیں بلکہ تنفیذ کا انداز ہے۔ یہ چیزیں الفاظ سے ہی ظاہر ہو رہی ہیں۔ ایک تو اس کی روح کے اعتبار سے یہ دو چیزیں ایک دوسرے کی غیر بن گئیں۔

دوسرے یہ کہ 'خیر' کو معین کیجیے! اب یہاں بھی لفظ عام ہے۔ چنانچہ اس کا اطلاق مختلف چیزوں پر ہو سکتا ہے۔ ایمان سب سے بڑا خیر ہے، شریعت کُل کی کُل خیر ہے۔ اس بارے میں جو رائیں بھی ہیں مَیں انہیں غلط نہیں کہتا۔ کسی نے اسلام کو خیر کہا، کسی نے توحید کو خیر کہا، کسی نے شریعت کو خیر کہا، کسی نے کلمۂ شہادت کو خیر کہا۔ تو یہ سب چیزیں اپنی جگہ پر صحیح ہیں، لیکن ہمیں حدیث نبویؐ سے معین کرنا ہوگا کہ خیر کا مصداقِ اوّل کیا ہے، جیسے حدیث نبویؐ سے حبل اللہ کا مصداقِ اوّل قرآن معین ہوا۔ خیر کا لفظ قرآن مجید میں اکثر و بیشتر دو معنی میں آتا ہے۔ خیر دُنیوی مال واسباب کے لیے بھی آتا ہے۔ جیسے فرمایا گیا ہے: ﴿وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ ۝۸﴾ (العدیٰت) ''اور یقیناً وہ (انسان) دُنیوی مال واسباب کی محبت میں شدید ہے''۔ سورۃ الاحزاب کی آیت ۱۹ میں بھی منافقین کے بارے میں آیا ہے: ﴿اَشِحَّةً عَلَى الْخَيْرِ ط﴾ اس کا ترجمہ شاہ عبدالقادر صاحبؒ نے یوں کیا ہے: ''وہ ڈھکے پڑتے ہیں مال پر''۔ یعنی جب لڑنے کا وقت ہوتا ہے تو وہ کہیں چھپ جاتے ہیں اور جب مالِ غنیمت کی تقسیم کا وقت آتا ہے تو سب سے آگے وہی ہوتے ہیں، سایہ کیے ہوئے ہوتے ہیں مالِ غنیمت پر سب سے آگے کہ انہیں lion's share مل جائے۔ تو خیر کا ایک مفہوم تو یہ ہے۔ لیکن ظاہر بات ہے کہ یہاں سیاق وسباق کے اندر اس کے فٹ بیٹھنے کا سرے سے امکان نہیں ہے کہ مال ودولتِ دُنیوی کی طرف دعوت دو۔ اب دوسرا خیر کیا ہے؟ وہ خیر ''ہدایت'' ہے۔ یہ بھی جان لیجیے کہ میں نے ہمیشہ یہ کہا ہے کہ دنیا میں نعمت صرف ایک ہی ہے اور وہ نعمتِ ہدایت ہے، کوئی اور شے نعمت نہیں ہے۔ جنہیں ہم عام طور پر نعمتیں کہتے ہیں وہ اگر نعمتِ ہدایت کے ساتھ ہوں تو نعمت ہیں، اس کے بغیر

ہوں تو زحمت ہیں۔ اسی لیے قرآن مجید میں اسی نعمت ہدایت کے بارے میں کہا گیا ہے کہ: ﴿اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ﴾ (المائدۃ:۳) ''آج کے دن میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت کا اتمام کر دیا''۔ یعنی نعمت ہدایت کا۔ اور ہدایت کیا ہے؟ الہدیٰ یہ قرآن ہے! آپ سوچیں گے کہ یہ تو ذرا لمبا اور ایچ پیچ استدلال ہے۔ اس کے لیے اب قرآن سے براہِ راست دلیل پیش کرتا ہوں۔ سورۂ یونس کی آیات ۵۷'۵۸ عظمت قرآن کے بیان میں بہت اہم ہیں۔ ان کے آخر میں فرمایا: ﴿هُوَ خَیْرٌ مِّمَّا یَجْمَعُوْنَ ﴿۵۸﴾﴾ ''وہ جو کچھ جمع کر رہے ہیں اُس سب سے بڑھ کر خیر یہی (قرآن) ہے''۔ یعنی یہ خیر مطلق ہے' تمام چیزوں سے بڑھ کر خیر ہے' رحمتِ خداوندی کا سب سے بڑا مظہر ہے۔ سورۃ الرحمٰن کے آغاز میں فرمایا: ﴿اَلرَّحْمٰنُ ﴿۱﴾ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ﴿۲﴾﴾ یعنی رحمٰن کی رحمانیت کا مظہر اتم اور مظہر کامل یہی قرآن ہے۔ تو دعوت الی الخیر کا ہدفِ اوّلین دعوت اِلی القرآن ہے۔ ظاہر بات ہے خیر کا اس سے بڑا منبع' سرچشمہ اور خزانہ کوئی متصور نہیں ہوسکتا۔

تو یہ دونوں پہلو آپ کے سامنے آ گئے۔ ایک یہ کہ دعوت الی الخیر' اور اس میں بھی سوز' نصح وخیر خواہی کا جذبہ اور یہاں تک کہ خوشامد۔ لوگوں کے سامنے گڑگڑائیے کہ خدا کے لیے قرآن کی طرف لوٹ آؤ' اپنی غلط روش سے باز آ جاؤ۔ لیکن دوسرے پہلو (امر بالمعروف ونہی عن المنکر) میں تحکّم بھی ہے اور قوت کا استعمال بھی ہے۔ یہ اس کی مزاجی نوعیت کا فرق ہے۔ اس سے بعض لوگوں نے ایک بہت بڑا دھوکہ کھایا ہے کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر صرف حکومت کے کرنے کا کام ہے۔ ان کے دھوکہ کھانے کا اصل سبب اس کے مزاج میں موجود یہی تحکّم ہے' اگرچہ ''امر'' کا لفظ عربی زبان میں عام ہے اور یہ صرف حکم کے لیے ہی نہیں بلکہ مشورے کے لیے بھی آتا ہے۔ ایک مصرع ملاحظہ کیجیے: ع

اَطَـــــــعْــــــــتِ لِاٰمِـــــــــرِیْکِ بِـــــــــصَـــــــــرْمِ حَبْـــــــــلِـــــــــیْ

شاعر اپنی محبوبہ سے کہہ رہا ہے کہ ''بالآخر تم نے ان ہی لوگوں کا کہنا مان لیا نا جو تمہیں مجھ سے ترکِ تعلق کا مشورہ دے رہے تھے''۔ تو یہاں ''امر'' حکم کے معنی میں نہیں' بلکہ مشورے کے معنی میں ہے۔ چنانچہ امر کے درجے میں یہ ساری چیزیں آ جائیں گی' لیکن غالب استعمال کے اعتبار سے لفظ ''امر'' میں زیادہ رجحان حکم کا ہے۔ لہٰذا اس میں ایک طرح کا تحکّم بھی ہے' یعنی اس میں تنفیذ ہے' طاقت کا استعمال ہے۔ اور نہی عن المنکر کے ضمن میں تو حدیث نبویؐ نے بالکل ہی واضح کر دیا کہ ایک نہی عن المنکر بالقلب ہے' ایک نہی عن المنکر باللّسان ہے اور ایک نہی عن المنکر بالید ہے۔ اس وجہ سے کچھ لوگوں کا خیال ہوگیا ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر تو صرف حکومت کے کرنے کا کام ہے۔

اس میں واقعتاً کوئی شک نہیں کہ جب اسلامی ریاست قائم ہو جائے تو اصلاً یہ اُس کا ہی منصب اور اسی کا فرض ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اسلامی ریاست کی ذمہ داری ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ط﴾ (الحج:۴۱) ''یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے' زکوٰۃ دیں گے' نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے منع کریں گے''۔ ویسے تو درحقیقت حکومت کی پوری پالیسی میں یہ چیز شامل ہونی چاہیے' لیکن سعودی عرب میں الگ سے ''هيئة الامر بالمعروف والنهي عن المنكر'' کے نام سے ایک محکمہ بنایا گیا تھا۔ میں اس کا چشم دید گواہ ہوں۔ ۱۹۶۲ء میں مَیں نے جدہ میں یہ نقشہ دیکھا تھا کہ نماز کا وقت آیا اور اس ہیئت امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا کوئی شخص محض لاٹھی بجاتا ہوا آیا' اسے کچھ کہنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی' بلکہ صرف لاٹھی کی کھٹ کھٹ کی آواز پر لوگ دکانیں بند کر کے بھاگنے لگے۔ اگرچہ کچھ لوگ دکان کا شٹر نیچے گرا کر اندر گھس گئے اور انہوں نے نماز نہیں پڑھی لیکن دکانیں بہرحال بند ہوگئیں۔ اور اب یہ حال ہے کہ اُس ہیئت کے ملازم بے چارے آتے ہیں اور زور زور سے الصلوٰۃ' الصلوٰۃ پکارتے ہیں' لوگ سنتے رہتے ہیں اور مسکراتے رہتے ہیں اور دکانوں کے شٹر نیچے نہیں گرتے۔ تو اس ہیئت کی مٹی اب پلید ہو چکی ہے' کیونکہ اوپر مزاج بدل چکا ہے۔ اب تو وہ اپنی تنخواہ لے رہے ہیں اور اپنا کام کر رہے ہیں۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ ان کی ڈیوٹی پوری ہوگئی۔ بہرحال میں عرض کروں گا کہ محض ایک محکمہ بنا لینے سے تو یہ کام ہوتا بھی نہیں۔ اس لیے کہ جب تک یہ چیز پوری حکومت کی مکمل پالیسی کا جزو نہ بنے محض محکمہ بنانے سے یہ تقاضا پورا نہیں ہوتا۔ چلیے محکمہ بھی بنایا ہو تو لوگوں کو معلوم ہو کہ اُن کے پاس کچھ اختیارات بھی ہیں۔ چوک میں کھڑے سپاہی سے' جو ٹریفک کنٹرول کر رہا ہوتا ہے' وہ لوگ لرزتے ہیں۔ اس شُرطے (سپاہی) کا خوف اور رعب ہے ان کے دلوں میں' اس لیے کہ اس کے پاس اختیار ہے' لیکن ان بے چاروں کے پاس کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ ان کے لیے تو اب ''مُطوّع'' کا لفظ عام ہو چکا ہے کہ یہ مُلاٹے کہاں سے آ گئے ہیں! بہرحال یہ تو محض سمجھانے کے لیے ایک ضمنی سی بات تھی۔

میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ صحیح ہے کہ یہ کام اصلاً ہو جاتا ہے حکومت کا جبکہ اسلامی حکومت قائم ہو۔ یہ ایک اسلامی حکومت کا فرض ہے' بلکہ یہ اس کے اوّلین فرائض میں داخل ہے۔ لیکن اگر اسلامی حکومت قائم نہیں ہے تو اس دلیل سے اپنے آپ کو بچا لینا ایک طرح کی فراریت ہے۔ یہ دین سے غداری ہے کہ اس وقت بھی آدمی یہ کہہ کر نکل جائے کہ یہ تو حکومت کے کرنے کا کام ہے۔ ایک شے ایک خاص محل میں صحیح ہوتی ہے۔ ظلم یہی تو ہے کہ ''وَضْعُ الشَّیْءِ فِیْ غَیْرِ مَحَلِّهٖ'' کہ کسی چیز کو اُس کی اصل جگہ سے ہٹا کر کہیں اور لے جانا۔ لہٰذا یہ اسلام کے ساتھ بدترین ظلم شمار ہوگا۔ اس کی مثال مَیں دیا کرتا ہوں کہ اگر حکومت قائم ہے' نظم ٹھیک ہے تو جان و مال کی حفاظت حکومت کی ذمہ داری ہے! فرض کیجیے کہ ملک میں انارکی ہو جائے' نظام درہم برہم ہو جائے' یا پولیس انتہائی کرپٹ ہو چکی ہو اور آپ کو پتا ہو کہ یہ پہرے دار تو خود ڈاکو بنے ہوئے ہیں' تو ان حالات میں آپ کیا

کریں گے؟ پاؤں پھیلا کر اطمینان سے سو جائیں گے یا اپنے پہرے کا انتظام کریں گے؟ بالکل وہی معاملہ یہاں ہے کہ اگر اسلامی حکومت قائم ہے تو امر بالمعروف ونہی عن المنکر اس کی ذمہ داری ہے‘ لیکن اگر اسلامی حکومت قائم نہیں ہے تو اب یہ ذمہ داری ایک ایک فرد پر منتقل ہو جاتی ہے اور یہ ہر فرد کے ایمان کا عین تقاضا ہے۔ لہٰذا مراتبِ ایمانی کے ساتھ علی الترتیب تین مراتب ہو جائیں گے: ایک نہی عن المنکر بالقلب۔ حدیث نبویؐ کی رو سے یہ اضعف الایمان ہے۔ دوسری حدیث میں آیا ہے کہ: ’’اس کے بعد تو ایمان رائی کے دانے کے برابر بھی نہیں ہے‘‘۔ دوسرا نہی عن المنکر باللّسان۔ یہ اس سے ذرا اوپر کا معاملہ ہے اور یوں سمجھئے کہ یہ دعوت کے ساتھ شامل ہو گیا۔ اور تیسرا مرتبہ جو مطلوب ہے‘ وہ ہے نہی عن المنکر بالید۔ تو اِن تین الفاظ کو اس طریقے سے علیحدہ علیحدہ سمجھنا ضروری ہے کہ جو بھی اجتماعیت مطلوب ہے اور جس اُمت کی تشکیل کی طرف یہ آیۂ مبارکہ راہنمائی کر رہی ہے‘ اس کے کرنے کا کام کیا ہے؟ فرمایا:﴿یَدْعُوْنَ اِلَی الْخَیْرِ﴾ ’’خیر کی طرف بلائیں‘‘۔ (میری ابتدائی تحریروں میں سے ایک مضمون ’’دعوت الی اللہ‘‘ ہے۔ اگر آپ نے اس کا مطالعہ کیا ہے تو یہاں اُس پورے مضمون کا خلاصہ اپنے ذہن میں رکھیے۔)

نہی عن المنکر کی خصوصی اہمیت

آگے فرمایا:﴿وَیَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ ط﴾ ’’اور نیکی کا حکم دیں اور بدی سے روکیں‘‘۔ یہاں آپ وہ احادیث پڑھ لیجیے اور انہیں یاد کرنے کی کوشش کیجیے۔ ان کے بارے میں پہلی اہم بات یہ ہے کہ دونوں مسلم شریف کی روایات ہیں۔ ان میں سے ایک حدیث جو حضرت ابوسعید خدریؓ سے مروی ہے‘ وہ تو پھر بھی مشہور ہے اور اس کو تقریر وتحریر میں بیان بھی کیا جاتا ہے‘ لیکن دوسری حدیث جو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے‘ وہ عام طور پر لوگوں کے ذہنوں سے بالکل خارج ہو چکی ہے‘ حالانکہ مسلمان معاشرے پر اطلاق کے اعتبار سے یہ حدیث بہت اہم ہے۔ پہلے ہم اسی حدیث کا مطالعہ کرتے ہیں جو زیادہ عام ہے۔

عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ :قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ :((مَنْ رَّاٰی مِنْکُمْ مُّنْکَرًا فَلْیُغَیِّرْہُ بِیَدِہٖ)) [1] حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ’’جو کوئی بھی تم میں سے دیکھے کسی منکر کو (کسی بدی کو) اس کا فرض ہے کہ اس کو بدلے اپنے ہاتھ سے‘‘۔ عام طور پر اس کا ترجمہ ’’اسے چاہیے‘‘ سے کیا جاتا ہے‘ لیکن اس سے بڑا مغالطہ ہو جاتا ہے۔ یہ اخلاقی تعلیم نہیں ہے‘ یہ ’’فعل امر‘‘ ہے۔ اور اَلْاَمْرُ لِلْوُجُوْبِ (امر وجوب کے لیے ہوتا ہے) اِلاّ یہ کہ کوئی اور قرینہ ہو۔ لہٰذا ترجمہ ہوگا: اس پر واجب ہے‘ لازم ہے‘ فرض ہے۔ یہ نزولی ترتیب ہے۔ یعنی اصلاً تو مطلوب یہ ہے‘ البتہ اگر کوئی مانع ہے تو اس کا دوسرا درجہ یہ ہے: ((فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِہٖ)) ’’پھر اگر استطاعت نہ رکھتا ہو تو اپنی زبان کے ساتھ اس سے روکے‘‘۔ استطاعت کا نہ ہونا دونوں اعتبارات سے ہوسکتا ہے۔ ایک تو یہ کہ آدمی بودا ہے‘ کمزور ہے‘ بزدل ہے‘ دوسرے یہ کہ حالات واقعی انتہائی خوفناک اور خطرناک ہو گئے ہیں۔ ان دونوں چیزوں سے نتیجہ ایک ہی نکلے گا کہ استطاعت نہیں ہے‘ داخلی یا خارجی۔ پس اگر بیچ میں یہ عارض موجود ہو‘ یعنی کوئی چیز رکاوٹ ہو تو پھر یہ دوسرا درجہ آئے گا کہ زبان سے اس برائی سے روکا جائے۔ بدقسمتی سے اس وقت یہ تصور عام کر دیا گیا ہے کہ یہ بس زبان سے ہی کرنے کا کام ہے‘ طاقت سے کرنے کا کام تو حکومت کا ہے۔ لہٰذا اس غلط فہمی کی اصلاح مطلوب ہے۔

آگے فرمایا:((فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِہٖ وَذٰلِکَ اَضْعَفُ الْاِیْمَانِ)) ’’اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو دل سے (برا جانے اور اسے بالید روکنے کے لیے قوت فراہم کرے) اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے‘‘۔ اس میں بھی استطاعت کا نہ ہونا خارجی اور داخلی دونوں اعتبارات سے ہوسکتا ہے۔ تو اس برائی کے خلاف دل میں نفرت ہو‘ طبیعت کے اندر اباء ہو‘ revolt ہو‘ بلکہ خون جوش میں آ رہا ہو۔ ایک معاملہ تو قہر درویش بر جانِ درویش والا بھی ہوتا ہے۔ اگر اس برائی کو ہاتھ سے روک دینے کی ہمت یا استطاعت نہیں ہے تو کم سے کم خون تو کھولے۔ اگر خون بھی نہیں کھول رہا تو گویا ایمان کی رمق بھی دل میں موجود نہیں ہے۔

یہاں وہ حدیث مبارکہ پیش نظر رہنی چاہیے جس میں حضور ﷺ نے فرمایا:

((اَوْحَی اللّٰہُ عَزَّوَجَلَّ اِلٰی جِبْرَاءِیْلَ عَلَیْہِ السَّلَامُ اَنِ اقْلِبْ مَدِیْنَۃَ کَذَا وَکَذَا بِاَھْلِھَا)) قَالَ :((فَقَالَ :یَارَبِّ اِنَّ فِیْھَا عَبْدَکَ فُلَانًا لَمْ یَعْصِکَ طَرْفَۃَ عَیْنٍ)) قَالَ :((فَقَالَ :اِقْلِبْھَا عَلَیْہِ وَعَلَیْھِمْ‘ فَاِنَّ وَجْھَہٗ لَمْ یَتَمَعَّرْ فِیَّ سَاعَۃً قَطُّ)) (رواہ البیھقی)

’’اللہ تعالیٰ نے جبرائیل علیہ الصلوٰۃ والسلام کو وحی کیا کہ فلاں فلاں بستی کو الٹ دو اُن کے رہنے والوں سمیت (اس لیے کہ وہ گنہگار ہیں)‘‘۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں: ’’تو جبرائیل علیہ السلام نے آ کر عرض کیا: ’’اے پروردگار! اس بستی میں تو تیرا ایک ایسا بندہ بھی ہے جس نے پلک جھپکنے جتنی دیر بھی تیری نافرمانی نہیں کی‘‘۔ آپ ﷺ فرماتے ہیں: ’’تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اس بستی کو پلٹو پہلے اس پر پھر دوسروں پر‘ اس لیے کہ میری حمیت میں ایک لمحے کے لیے بھی اس کا چہرہ متغیر نہیں ہوا‘‘۔

ایسا شخص تو بے حمیت اور بے غیرت ہے کہ اِن حالات میں اس کے احساسات پر جوں تک نہیں رینگتی' اس کا خون نہیں کھولتا۔ کم از کم خون تو کھولے! اس کے بعد اگر حالات کے جبر کی کیفیت ہے' کوئی مجبوری ہے تو الگ بات ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ کمزور سے کمزور انسان کو بھی اگر ماں کی گالی دی جائے' اور چاہے وہ اپنی کمزوری کے سبب گالی دینے والے پر اپنا ہاتھ نہ اٹھا سکے' مگر وہ غصے سے کانپے گا تو سہی' اس کا خون تو کھولے گا' چاہے وہ لرز کر اور کانپ کر اپنی جگہ پر رہ جائے اور کچھ کر نہ سکے۔ لیکن اگر اس کا خون بھی نہیں کھولتا تو پھر تو وہ بے غیرت ہے۔ اور یہ ''بے غیرت'' پٹھانوں کے نزدیک سب سے بڑی گالی ہے' کوئی اور گالی اس کے ہم وزن نہیں ہے۔

اب ہم مسلم شریف کی دوسری حدیث کا مطالعہ کرتے ہیں۔ یہ حدیث خاص طور پر کسی مسلمان اُمت کے ضمن میں اہم تر ہے۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ : حضرت عبداللہ بن مسعودؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((مَا مِنْ نَبِیٍّ بَعَثَهُ اللّٰهُ فِیْ اُمَّةٍ قَبْلِیْ اِلاَّ کَانَ لَهٗ مِنْ اُمَّتِهٖ حَوَارِيُّوْنَ وَاَصْحَابٌ)) ''کوئی نبی ایسا نہیں گزرا جسے اللہ نے مجھ سے پہلے کسی اُمت میں مبعوث کیا ہو مگر یہ کہ اس کے لیے اس کی اُمت میں سے حواری اور اصحاب ہوتے تھے''۔ حواری کا لفظ قرآن مجید میں خاص طور پر حضرت عیسٰیؑ کے ساتھیوں کے لیے آیا ہے اور اصحاب کا لفظ تو ہم نبی کریم ﷺ کے ساتھیوں کے لیے بھی بولتے ہیں۔ تو ان تمام کو شامل کر لیجیے! یعنی وہ لوگ جو اُن کے ساتھی' دست و بازو اور جان نثار بنتے تھے' ان کے مقصد کی تکمیل کے لیے تن من دھن لگانے کے لیے تیار رہتے تھے' جو انصار اللہ اور انصار الرسول بنتے تھے وہ سب حواری اور اصحاب ہیں۔ ان اصحاب کا طرزِ عمل کیا تھا! ((يَاْخُذُوْنَ بِسُنَّتِهٖ وَيَقْتَدُوْنَ بِاَمْرِهٖ)) ''وہ اس کی سنت کو مضبوطی سے پکڑتے تھے اور اس کے حکم کا اقتداء کرتے تھے''۔

((ثُمَّ اِنَّهَا تَخْلُفُ مِنْ بَعْدِهِمْ خُلُوْفٌ)) ''پھر اُن کے بعد ایسے ناخلف لوگ آ جاتے تھے''۔ اب یہ لوگ کون ہیں؟ ہیں تو اُمتی ہی' نام لیوا تو ہیں' اس نبی کو ماننے والے تو ہیں' لیکن وہ ناخلف لوگ کیا کرتے تھے؟ ((يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ)) ''کہتے وہ تھے جو کرتے نہیں تھے''۔ اسلام کی بات کہنی تو پڑتی ہے۔ مسلمان معاشرے میں اسلام کی بات زبان سے کہے بغیر تو چارہ کار نہیں ہے۔ ((وَيَفْعَلُوْنَ مَا لَا يُؤْمَرُوْنَ)) ''اور کرتے وہ تھے جس کا انہیں حکم نہیں ہوا تھا''۔ اب اس میں قول و فعل کا تضاد' عمل میں فسق و فجور اور بدعات تینوں چیزیں آ گئیں۔ یہ ہے گویا وہ بگڑا ہوا مسلمان معاشرہ جو اِس درس کا عنوان ہے اور یہ اس کی بہترین تعبیر ہے۔ اس سے زیادہ جامع الفاظ ممکن نہیں۔ یہاں حضور ﷺ کا وہ دعویٰ ملاحظہ کیجیے کہ ((اُوْتِيْتُ جَوَامِعُ الْكَلِمِ)) ''مجھے (اللہ کی طرف سے) انتہائی جامع کلمات عطا کیے گئے ہیں''۔ اور یہ کہ ((اَنَا اَفْصَحُ الْعَرَبِ)) ''میں عرب کا فصیح ترین انسان ہوں''۔

اب اس صورتِ حال میں کیا کرنا ہے؟ فرمایا: ((فَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِيَدِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ)) ''تو جو ایسے لوگوں سے جہاد کرے گا اپنے ہاتھ سے تو وہ مؤمن ہے'' ((وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِلِسَانِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ)) ''اور جو اُن کے ساتھ جہاد کرے گا اپنی زبان سے وہ مؤمن ہے'' ((وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِقَلْبِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ)) ''اور جو اُن سے جہاد کرے گا اپنے قلب سے وہ مؤمن ہے'' ((وَلَيْسَ وَرَآءَ ذٰلِكَ مِنَ الْاِيْمَانِ حَبَّةُ خَرْدَلٍ)) ''اور اس کے بعد تو ایمان رائی کے دانے کے برابر بھی نہیں''۔ (۱)

ان الفاظ میں پورا لائحہ عمل موجود ہے۔ اس سے عیاں ہے کہ طاقت نہیں ہے تو طاقت حاصل کرو۔ جیسے ارشادِ الٰہی ہے: ﴿وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ﴾ (الانفال:۶۰) ''اور اُن کے مقابلے کے لیے اپنی امکانی حد تک تیاری کرو''۔ یہاں اگر طاقت حاصل کرنے کی امکانی جدوجہد تم کر لو اور طاقت ہاتھ میں نہ آئے تو تم معذور ہو گے۔ لیکن طاقت تم نے چھوڑ دی ہو فساق و فجار کے لیے اور خود قانع ہو گئے ہو اپنے کچھ مذہبی مناصب پر' میدان کھلا چھوڑ دیا ہو فاسقوں اور فاجروں کے لیے' خود اُن کا ضمیمہ بن جانا قبول کر لیا ہو تو یہ ہرگز نہ قرآن کا تقاضا ہے' نہ ایمان کا تقاضا ہے اور نہ عقل کا تقاضا ہے۔ لہٰذا طاقت حاصل کرو' جدوجہد کرو' جمعیت فراہم کرو! آج کے دَور کی اصل طاقت جمعیت ہے۔ کتنے پیارے الفاظ ہیں سراج منیر کے کہ ''نتیجہ خیزی کا دارومدار تنظیم پر ہے''۔ یہ ہے اُمت ﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ﴾۔ قوت تو اسی سے وجود میں آتی ہے۔ اور یہ کس طریقے سے وجود میں آتی ہے؟ یہ قوت ''ایک اکیلا دو گیارہ'' کے تناسب سے بڑھتی ہے' جسے آپ Geometric progression کہتے ہیں۔ لہٰذا طاقت حاصل کرو' جماعت بناؤ! جب ایک منظّم جماعت (disciplined organization) وجود میں آ جائے تو پھر اپنی پسند اور ناپسند کا مظاہرہ (Demonstration of your will) کرو' یعنی یہ بتاؤ کہ یہ بات ہمیں پسند نہیں ہے۔ اور یہ بھی میرے نزدیک ابھی نہی عن المنکر باللّسان کی ایک صورت ہے۔ باللّسان کی ایک صورت وعظ و نصیحت ہے۔ ہر مسجد کا خطیب اور ہر خادمِ دین وعظ کر رہا ہے۔ وہ نہی عن المنکر باللسان میں شامل ہو گیا۔ لیکن اس کے بعد یہی بات جب آپ منظّم اور پُرامن طریقے سے ایک اجتماعی مظاہرے کی شکل میں سامنے لائیں گے' تو یہ بھی باللسان ہی ہے' لیکن یہ اب گاڑھا ہو گیا ہے۔

موجودہ دَور میں 'جہاد بالید' کی عملی صورت

اب دیکھئے ''نہی عن المنکر بالید'' کیا ہے؟ یہ کہ آپ گھیراؤ کریں کہ فلاں کام شریعت کے خلاف ہے' ہم جیتے جی نہیں ہونے دیں گے۔اس کا نام گھیراؤ (picketing) ہے' کہ ہم ظالم کا ہاتھ پکڑ لیں گے' ظلم نہیں ہونے دیں گے۔ جو شے بھی دین کے خلاف ہے وہ ظلم ہے۔ یہ سب ظلم کے مظاہر ہیں۔حق صرف یہ ہے کہ زمین اللہ کی ہے' اس پر قانون اللہ کا چلے گا۔اس سے انحراف ہی تو ظلم ہے۔یہی تو دراصل کفر اور شرک ہے۔از روئے الفاظِ قرآنی:﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴾ ...... فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۴۵﴾ ......فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۴۷﴾ ﴾ (المائدۃ) ''اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی تو کافر ہیں......وہی تو ظالم ہیں......وہی تو فاسق ہیں''۔اس کفر' ظلم اور فسق کے خلاف جب اقدام ہوگا کہ ہم یہ نہیں ہونے دیں گے تو اس کا لازمی نتیجہ تصادم کی صورت میں نکلے گا۔ایک امکان ہے کہ اس میں انقلابی جماعت کو پسپائی ہو جائے۔اگر ایسا ہو جائے تو فبہا' اور کیا چاہیے! اور اگر کامیابی نصیب ہو جائے تو اسی انداز سے ایک ایک کر کے منکرات کو اِس قوت کے ساتھ ہٹواتے چلے جائیں گے۔یہی ہمارا مطلوب ہے۔اس کے لیے اقتدار حاصل کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔حکومت طلب کرنا تو اصلاً بیماری اور مرض ہے۔ یہ بڑا پُرخطر راستہ ہے۔اِدھر کہاں جاتے ہو؟ مت ماری گئی ہے اُن کی جو اِس راستے کو اختیار کرنا چاہتے ہیں۔اس راستے میں تو طالع آزما لوگ آپ کے ساتھ آئیں گے۔آپ کو کیا پتا کہ ان کے دل میں کیا ہے؟ کس کا دل چیر کر آپ دیکھیں گے؟ کسی کے دل میں حبِّ جاہ اندر ہی اندر مچل رہی ہو تو آپ کو کیا پتا! لیکن اس انقلابی راستے پر تو وہی آئے گا جو سر پر لاٹھی کھانے کو تیار ہو۔ یہاں وہی آئیں گے کہ جو اپنی جان کی بازی لگانے کو تیار ہوں۔امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا جو بلند ترین درجہ ہے اس میں جان کا خطرہ تو موجود ہے۔اس لیے کہ تصادم ہو کر رہے گا۔اگر حکومت پسپائی نہیں کر رہی ہے تو وہ لاٹھیاں برسائے گی' آنسو گیس چھوڑے گی' جیلوں میں ٹھونسے گی' گولیاں برسائے گی۔تو اس میں جان کا اندیشہ تو بہرحال ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اب اس مضمون کو سورۃ التوبۃ کی اس آیت سے جوڑا گیا ہے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ط﴾ (التوبۃ:۱۱۱) ''یقیناً اللہ تعالیٰ نے مؤمنوں سے اُن کی جانیں اور ان کے مال خرید لیے ہیں جنت کے عوض''۔گویا اس کام کے لیے تو سرفروش چاہئیں۔﴿يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ قف﴾ ''وہ جنگ کرتے ہیں اللہ کی راہ میں' پس وہ قتل کرتے بھی ہیں اور قتل ہوتے بھی ہیں''۔حضور ﷺ کے دَور میں تو دو طرفہ معاملہ تھا کہ مسلمان قتل کرتے بھی تھے اور قتل ہوتے بھی تھے' جبکہ اِس دَور میں صرف یک طرفہ طور پر قتل ہونے کا معاملہ ہے۔اگرچہ اس کی شرائط پوری ہو رہی ہوں تو قتال بھی جائز ہے۔اگر کچھ فساق و فجار دین کے راستے کے اندر ایک رکاوٹ بن کر کھڑے ہو گئے ہوں اور آپ نے باقی سارے تقاضے پورے کر لیے ہوں تو کیا ان کی جانیں اتنی مقدس ہیں کہ ان کی وجہ سے دین کو پامال رہنے دیا جائے؟ یہ بات نہ عقل کی میزان پر پوری اترنے والی ہے اور نہ نقل کی میزان پر۔

حدیث نبویؐ میں ''جہاد بالید'' کے الفاظ ہیں۔یعنی ہاتھ سے جہاد' قوت سے جہاد۔اب دیکھنا یہ ہے کہ دَورِ نبویؐ میں جہاد بالید کا کیا تصور تھا جب حضور ﷺ نے جہاد بالقلب' جہاد باللسان اور جہاد بالید کے الفاظ ادا فرمائے؟ اس وقت تو جہاد بالید کے معنی قتال ہی کے تھے' کیونکہ اس وقت تو مظاہروں (demonstrations) کا کوئی طریقہ نہیں تھا اور نہ ہی یہ موجودہ سیاسی ادارے وجود میں آئے تھے۔یہ تو آج کے دَور میں اس عمرانی ارتقاء کی بنیاد پر مظاہروں اور گھیراؤ کی صورت پیدا ہوگئی ہے۔لہٰذا میرے نزدیک اس حوالے سے امام ابوحنیفہؒ کا موقف صدفی صد درست ہے۔کچھ بہت ہی محتاط قسم کے لوگ اور بعض روایات کے ظاہر پر بہت زیادہ ڈیرہ ڈال دینے والے یہ سمجھ بیٹھے کہ کسی حال میں بھی مسلمان کے خلاف بغاوت نہیں کی جاسکتی اِلاّ یہ کہ وہ کلمۂ کفر کہے اور کفر کو نافذ کرے۔اس کے لیے حکمت کی ضرورت ہے کہ اس موضوع پر جملہ روایات کو سامنے رکھ کر اُن میں تطبیق پیدا کی جائے' ان کو جمع کیا جائے' ان میں باہم موازنہ کیا جائے اور پھر اُن سے نتیجہ نکالا جائے۔جبکہ امام ابوحنیفہؒ کا موقف یہ ہے کہ فاسق و فاجر حکمرانوں کے خلاف بغاوت کی جاسکتی ہے' البتہ اس کی شرائط بہت ساری ہیں۔لہٰذا اس کو بھی آپ مطلقاً خارج از بحث نہ کیجیے۔آج اس کو خارج از بحث کرنے کا جو تصور ہے یہ سب سے زیادہ زور اور شدت کے ساتھ غلام احمد قادیانی نے دیا تھا اور یہ چیزیں ہمارے بہت سے حلقوں کے ذہنوں کے اندر مختلف درجے میں سرایت کیے ہوئے ہیں۔بہرحال میں نے اس کو سورۃ التوبۃ کی آیت ۱۱۱ کے ساتھ جوڑا ہے۔جن مؤمنین نے جنت کے عوض اللہ سے اپنے جان و مال کا سودا کیا ہے وہ کس ہستی کے ہاتھ پر کیا ہے' یہ ہم سورۃ الفتح کی آیت میں پڑھ چکے ہیں:﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ط﴾ ''یقیناً جو لوگ آپؐ سے بیعت کر رہے ہیں وہ دراصل اللہ سے بیعت کر رہے ہیں''۔

اب اگلی آیت (آیت ۱۱۲) میں ان مؤمنین کے نو اوصاف بیان ہوئے ہیں۔ایک بات تو یہ نوٹ کیجیے کہ ابتدا ''اَلتَّـــائِبُـوْنَ'' کی صفت سے ہے کہ وہ اللہ کے حضور توبہ کرنے والے ہوتے ہیں۔ یہ پہلا قدم ہے۔تنظیم اسلامی کے ہر کتابچے پر ہماری ایک تحریر چھپتی رہی ہے: ''تنظیم اسلامی کی اساسی دعوت: تجدید ایمان' توبہ' تجدید عہد''۔تو یہ نقطۂ

آغاز ہے۔ ایک مسلمان معاشرے میں اصلاح کا آغاز ایمان لانے سے نہیں بلکہ ایمان کی تجدید سے ہوگا۔ اسی کا نام توبہ ہے۔ اس کے بعد دوسری صفت ''اَلْعٰبِدُوْنَ'' ہے کہ اب خود اللہ کے بندے بنو' اس کی بندگی کے تقاضے پورے کرو۔ جیسا کہ سورۃ الحج کے آخر میں ارشاد ہوا: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَیْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۷۷﴾﴾ ''اے ایمان والو! رکوع کرو' اور سجدہ کرو' اور اپنے ربّ کی بندگی کرو اور بھلائی کے کام کرو تاکہ تم فلاح پا جاؤ''۔ پہلے قدم کے بغیر دوسرا قدم نہیں ہوگا اور دوسرے قدم کے بغیر تیسرا قدم نہیں ہوگا۔ اس کے بعد ''اَلْحٰمِدُوْنَ'' کی صفت آئی ہے کہ وہ اللہ کی حمد کرنے والے ہوتے ہیں۔ اس کا زیادہ تعلق انسان کے شعور' ذہن اور فکر کے ساتھ ہے۔ جتنی اللہ کی معرفت بڑھے گی اتنی ہی اللہ کی حمد کی جا سکے گی۔

اس کے بعد چوتھی صفت ''اَلسَّآئِحُوْنَ'' کی ہے کہ وہ سیاحت کرنے والے (لذاتِ دُنیوی سے کنارہ کش رہنے والے) ہوتے ہیں۔ اس صفت کا عمل سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ سیاحت کسے کہتے ہیں؟ پرانے زمانے میں سیاحت یہ ہوتی تھی کہ لوگ بن باس لے لیتے تھے۔ جنگلوں کو نکل جاتے تھے۔ یہ تربیت کا ایک خاص اسلوب رہا ہے۔ اس نے ایک institution کی شکل اختیار کر لی جسے ہم ''رہبانیت'' کہتے ہیں۔ اس کی اسلام میں نفی کی گئی ہے۔ لیکن حضورﷺ نے فرمایا کہ اسلام میں ''سیاحت'' صوم یعنی روزہ ہے۔ یہ بھی تو ایک طرح کی رہبانیت ہے کہ نہ کھانا ہے' نہ پینا ہے اور نہ تعلق زن وشو ہے۔ جہاد فی سبیل اللہ بھی اسلام کی رہبانیت ہے۔ اس میں بھی آدمی کو گھر کے آرام اور گھر کی سہولتوں وغیرہ کو چھوڑ کر اللہ کی راہ میں نکلنا پڑتا ہے۔ یہاں اس چیز کو خاص طور پر نوٹ کیجیے۔ یوں سمجھئے کہ زمین سے جڑے رہنے کے ذہن اور مزاج کو بدلنا ہوگا۔ سیاحت اصلاً یہی ہے کہ اللہ کی راہ میں نکلنا۔ یہ نہ ہو کہ ع ''حضرتِ داغ جہاں بیٹھ گئے بیٹھ گئے!'' دنیا کے لیے تو بہتر سے بہتر اور اعلیٰ سے اعلیٰ کی تلاش میں یہاں سے وہاں نقل مکانی کرتے پھریں' لیکن دین کے معاملے میں یہ سمجھیں کہ یہ کیسے مناسب ہے کہ کسی کے ہاتھ میں اختیار دے دیا جائے کہ وہ جب ہمیں طلب کرے' ہم حاضر ہو جائیں گے۔ یہ چیز عکس ڈال رہی ہے انسان کے value structure پر کہ اس کے ہاں کس چیز کی کیا اہمیت ہے۔ کبھی اس بارے میں سوچا کہ دُنیوی معاملات میں تو گھر والے کبھی آڑے نہیں آتے' جہاں بہتر روزگار مل رہا ہو وہاں گھر والے خود بھیجتے ہیں اور سامان باندھنے میں بیوی بچے سب لگ جاتے ہیں' جبکہ دین کے معاملے میں کہتے ہیں پاگل ہو گئے ہو' دماغ خراب ہو گیا ہے؟ گھر بار چھوڑ رہے ہو؟ بیٹھے رہو! حالانکہ کوئی حرکت اس کے بغیر نہیں چل سکتی کہ یہ ترجیح معین ہو کہ تمہارا تعلق کس کے ساتھ ہے ـــــ زمین سے یا اللہ سے؟ زمین سے یا دین سے؟ سورۃ العنکبوت میں یہی بات کہی گئی ہے: ﴿یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ اَرْضِیْ وَاسِعَةٌ فَاِیَّایَ فَاعْبُدُوْنِ ﴿۵۶﴾﴾ ''اے میرے اہل ایمان بندو! میری زمین وسیع ہے' پس تم میری ہی بندگی کرو''۔ یعنی دین کے تقاضے جہاں اور جس طور سے بہتر سے بہتر ادا ہوں وہاں چلے جاؤ۔ حرکت میں رہو! زمین کے اندر کہیں جڑیں نہ اتار لو کہ نہ زمین ہلے نہ ہم ہلیں۔ انسان سوچتا ہے کہ میں نے یہاں محنت کی ہوئی ہے' یہاں پریکٹس جمائی ہوئی ہے' میری بیس سال کی مشقت اس زمین میں گڑی ہوئی ہے' یہاں سے ہل جاؤں تو مجھے کہیں جا کر از سرنو پریکٹس جمانی ہوگی۔ یہاں میری شہرت ہے اور میرے تعلقات ہیں۔ تو فرمایا کہ یہ اللہ کی راہ میں سیاحت کرنے والے ہوتے ہیں۔ ان کا نظریہ بقول اقبال یہ ہوتا ہے: ع ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست۔

پھر یہ کہ ﴿اَلرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ﴾ ''(وہ) رکوع کرنے والے اور سجدہ کرنے والے (ہوتے ہیں)''۔ جھکنے کی ابتدا رکوع سے ہوتی ہے اور انتہا سجدہ ہے۔ آگے فرمایا: ﴿اَلْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ؕ﴾ ''(یہ) نیکی کا حکم دینے والے اور برائی سے روک دینے والے اور اللہ کی حدود کی حفاظت کرنے والے (ہوتے ہیں)''۔ اس میں لفظ ''اَلْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ'' نہایت اہمیت کا حامل ہے کہ اللہ کی حدود کی حفاظت کرنے والے۔ اس کو سمجھ لیجیے کہ ایک ہے خود حدود اللہ پر قائم رہنا۔ اس کا حکم تو پہلے آ چکا ہے کہ اللہ کا تقویٰ اختیار کرو' دیکھنا موت نہ آئے مگر حالت فرمانبرداری میں۔ اور پھر ''اَلْعٰبِدُوْنَ'' میں بھی یہ بات آ گئی ہے۔ لہٰذا یہاں محض یہ مطلب نہیں ہے کہ اللہ کی حدود کی خود حفاظت کرنا اور اس پر کاربند رہنا۔ یہ بات بھی اس کے مفہوم میں شامل ہے' مگر اس کا مطلب اصلاً یہ ہے کہ اللہ کی حدود کے پہرے دار بن کر کھڑے ہو جاؤ کہ انہیں اب نہیں توڑنے دیں گے۔ خدائی فوج دار بنو کہ ہم اللہ کے سپاہی ہیں اور اُس کی حدود کے محافظ ہیں۔ یہ ذمہ داری ہے جو تم پر ڈالی گئی ہے۔ ترتیب اور سیاق دیکھئے کہ کہاں سے چلی ہے یہ بات! ﴿اَلْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ؕ﴾ کہ اللہ کی حدود کے پہرے دار بن کر کھڑے ہو جاؤ' سنتری بن جاؤ! کوئی تمہیں گرانے کے بعد ہی اللہ کی حد توڑ سکے۔ جیسے گاندھی نے کہا تھا: پاکستان صرف میری نعش پر بن سکتا ہے۔ جسے ہم محاورے میں کہتے ہیں کہ فلاں کام ہم جیتے جی نہیں ہونے دیں گے۔ تو ''اَلْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ'' کا یہاں یہ مطلب ہے۔ یہ ہے اقدام کا عنوان! یہ ہے ایک بگڑے ہوئے اسلامی معاشرے میں قرآن وحدیث کی رہنمائی میں اسلامی انقلاب کے لیے آخری اقدام!!

بارك الله لى ولكم فى القرآن العظيم ونفعنى واياكم بالآيات والذكر الحكيم